ماہنامہ

اشراق

لاہور

ستمبر ۲۰۱۹ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”قرآن اِس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے، وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور اُنھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی، بلکہ اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت —— امت مسلمہ —— کے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ جب قوموں نے اِس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اِس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ اِن نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی، بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی تو اُنھوں نے اِسی دین کے مزید مقتضیات نمایاں کیے۔ قرآن اِسی مبارک سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اُس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدم و نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اُس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۳۱ شمارہ ۹ ستمبر ۲۰۱۹ء محرم الحرام ۱۴۴۰ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)
بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات
منصب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم — جناب جاوید احمد غامدی کا موقف: ''الفرقان'' کی تنقید پر تبصرہ (۱) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات
البیان: المؤمنون ۲۳: ۵۱-۶۷ (۴) — جاوید احمد غامدی — ۸

مقالات
قرآن وسنت کا باہمی تعلق: اصولی مواقف کا ایک علمی جائزہ (۹) — محمد عمار خان ناصر — ۱۲

نقطۂ نظر
قومیت بطور مذہب — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۲۲

سیر و سوانح
حضرت علی رضی اللہ عنہ (۹) — محمد وسیم اختر مفتی — ۲۸

اصلاح و دعوت
باحجاب بے حیائی — محمد ذکوان ندوی — ۵۰
جھوٹ اور سچ — محمد تہامی بشر علوی — ۵۲

یسئلون
عنِ ''البیان'' — رضوان اللہ — ۶۰

وفیات
زاہد حسین: برادر منفرد — ساجد حمید — ۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

منصب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم —— جناب جاوید احمد غامدی کا موقف

"الفرقان" کی تنقید پر تبصرہ

(۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

"غامدی فکر کی بنیادی گمراہی" کے زیر عنوان مولانا یحییٰ نعمانی کا مضمون پیش نظر ہے۔ یہ ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے جولائی ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ "المورد" ہند سے ہمارے ایک رفیق نے اِس پر "اشراق" کا تبصرہ دریافت کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اِس کی ثقاہت اور علمی وقعت سے قطع نظر، چونکہ اِس کے مصنف کی نسبت مولانا منظور نعمانی جیسے جلیل القدر عالم دین سے ہے اور اس کی اشاعت ایک موقر جریدے میں ہوئی ہے، اِس لیے اِس پر ہمارا تبصرہ ضروری ہے۔ اُن کی خواہش کے احترام میں ہمارا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

ہمارے نزدیک یہ ایک تاثراتی تحریر ہے جس کے بیش تر اجزا صریحاً غلط، بعض سوء فہم کا مظہر اور بعض خلط مبحث پر مبنی ہیں۔ اِس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

فاضل مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے صرف قرآن مجید کو بطور دین قبول کرتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ وہ آپ کی ذات اقدس کو دین دینے کا حق دار اور مجاز تسلیم نہیں کرتے۔ —— معاذ اللہ —— اُنھوں نے لکھا ہے:

"...افسوس وہ مقام رسالت کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس

کے اہل و حق دار ہی نہیں کہ ان کے ذریعے (قرآن کے علاوہ) دین کا کوئی عقیدہ یا عمل انسانوں کو دیا جائے۔ وہ منصب رسالت کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتے کہ وہ دین کا کوئی حکم قرآن کے علاوہ جاری کرے۔" (۳۱)

یہ بات صریح طور پر غلط اور دروغ، دشنام، بہتان اور الزام تراشی پر مبنی ہے۔ اِس کی تردید کے لیے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی یہ برہان قاطع ہی کافی ہے:

"... دین کا تنہا ماخذ اِس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف اُنھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو اُن کے پروردگار کی ہدایت میسر ہو سکتی ہے اور یہ صرف اُنھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے۔" (میزان ۱۳)

اِس جملے کے معنی یہ ہیں کہ جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک:

۱۔ اِس کرۂ ارض پر دین دینے کا حق صرف اور صرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اِس کا مجاز اور حق دار نہیں ہے۔

۲۔ آپ کا یہ حق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلم ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے، اُس وقت تک انسانیت کو اللہ کی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آپ ہی سے رجوع کرنا ہے۔

۳۔ دین سے متعلق ہر عقیدہ و ایمان، علم و حکمت، طریقہ و عمل اور قانون و شریعت کا منبع، مصدر اور ماخذ آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔

۴۔ آپ اپنے قول سے دین کے بارے میں جو بات کہیں، وہ دین ہے۔

۵۔ آپ اپنے فعل سے جو دینی عمل صادر کریں، وہ دین ہے۔

۶۔ لوگوں کے علم و عمل پر آپ کا سکوت بھی دین ہے، آپ کی تقریر بھی دین ہے، آپ کی تائید بھی دین ہے، آپ کی تردید بھی دین ہے اور آپ کی تصویب بھی دین ہے۔

۷۔ قرآن اِس لیے دین ہے کہ وہ ہمیں آپ کے قول سے ملا ہے۔

۸۔ سنت اِس لیے دین ہے کہ وہ ہمیں آپ کے عمل سے ملی ہے۔

۹۔ حدیث اِس لیے دین ہے کہ وہ آپ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایت ہے۔

۱۰۔ سابق الہامی صحائف اور دین ابراہیمی کی روایت میں سے اُسی چیز کو دین کی حیثیت حاصل ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِسی بات کو خاص قانون کے زاویے سے استاذ گرامی نے اپنی کتاب ''برہان'' میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

''... محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات قیامت تک کے لیے اُسی طرح واجب الاطاعت ہیں، جس طرح خود قرآن واجب الاطاعت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اُس کی کتاب پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا۔ رسول کی حیثیت سے آپ کا ہر قول و فعل بجاے خود قانونی سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۳۸)

اِس سے واضح ہے کہ فاضل مصنف کا یہ الزام سراسر لغو اور بے بنیاد ہے کہ غامدی صاحب قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والے احکام و ہدایات کو دین کے طور پر قبول نہیں کرتے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ آپ قرآن کے علاوہ بھی دین دینے کے مجاز ہیں۔ غامدی صاحب کے فکر و عمل اور تحریر و تقریر کا ایک ایک جز اِس الزام کو رد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر جب بعض اہل علم نے حدیث و سنت کی حجیت کے حوالے سے اُن کے موقف کی وضاحت چاہی تو اُنھوں نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کیا کہ وہ دین کو صرف قرآن ہی میں منحصر نہیں سمجھتے، بلکہ حدیث و سنت کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے ملنے والے احکام و ہدایات کو بھی من جملہ دین قرار دیتے ہیں اور اُنھیں قرآن ہی کی طرح واجب الاطاعت مانتے ہیں۔ ''حدیث و سنت'' کے زیر عنوان اُن کی یہ تحریر ''مقامات'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو قرآن دیا ہے۔ اِس کے علاوہ جو چیزیں آپ نے دین کی حیثیت سے دنیا کو دی ہیں، وہ بنیادی طور پر تین ہی ہیں:

۱۔ مستقل بالذات احکام و ہدایات جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی۔

۲۔ مستقل بالذات احکام و ہدایات کی شرح و وضاحت، خواہ وہ قرآن میں ہوں یا قرآن سے باہر۔

۳۔ اِن احکام و ہدایات پر عمل کا نمونہ۔

یہ تینوں چیزیں دین ہیں۔ دین کی حیثیت سے ہر مسلمان اِنھیں ماننے اور اِن پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن کی نسبت کے بارے میں مطمئن ہو جانے کے بعد کوئی صاحب ایمان اِن سے انحراف کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہ اگر مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی تردد کے اِن کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔'' (مقامات ۱۶۱-۱۶۲)

اِس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”... سنت کے ذریعے سے جو دین ملا ہے، اُس کا ایک بڑا حصہ دین ابراہیمی کی تجدید واصلاح پر مشتمل ہے۔ تمام محققین یہی مانتے ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس میں محض جزوی اضافے کیے ہیں۔ ہرگز نہیں، آپ نے اِس میں مستقل بالذات احکام کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اِس کی مثالیں کوئی شخص اگر چاہے تو ”میزان“ میں دیکھ لے سکتا ہے۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ دین کے جن احکام کی ابتدا اُس سے ہوئی ہے، اُن کی تفصیلات ”میزان“ کے کم و بیش تین سو صفحات میں بیان ہوئی ہیں۔ میں اِن میں سے ایک ایک چیز کو ماننے اور اُس پر عمل کرنے کو ایمان کا تقاضا سمجھتا ہوں، اِس لیے یہ الزام بالکل لغو ہے کہ پہلے سے موجود اور متعارف چیزوں سے ہٹ کر کوئی نیا حکم دینا یا دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کرنا میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے دائرۂ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔“ (مقامات ۱۶۲-۱۶۳)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمنون

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ۟ؕ ﴿۵۱﴾
وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

(اِن پیغمبروں سے ہم نے یہی کہا کہ) اے پیغمبرو، (تم اِن لوگوں کے توہمات کی پروا نہ کرو[۱۸۲] اور) پاکیزہ چیزیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور اچھا عمل کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو[۱۸۳]۔ یہ تمھاری امت ہے، ایک ہی امت[۱۸۴] اور میں تمھارا پروردگار ہوں، سو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۵۱-۵۲

۱۸۲۔ یعنی اُن مشرکانہ توہمات کی جن کے تحت اِنھوں نے بعض طیبات کو بھی حرام ٹھیرالیا ہے۔

۱۸۳۔ یعنی نیک یا بد جو کچھ بھی کرتے ہو، اُس کو جانتا ہوں، اِس لیے نیکی کا صلہ بھی دوں گا اور برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو اُس کی سزا بھی لازماً ملے گی۔

۱۸۴۔ مطلب یہ ہے کہ دین کے نام پر الگ الگ امتیں لوگوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ خدا نے جو دین تمھیں دیا ہے، وہ ایک ہی ہے، لہٰذا امت بھی اصلاً ایک ہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ
فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ۙ
نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

پھر لوگوں نے (اُن کے بعد) اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ اب ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اُسی میں مگن ہے۔ سو اِنھیں کچھ دن اِن کی اِس سرمستی میں رہنے دو۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال اور بیٹے اِن کو دیے جا رہے ہیں تو گویا اِن کو بھلائیاں پہنچانے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، بلکہ اِن کو حقیقت کا شعور نہیں ہے[۱۸۵]۔ ۵۳-۵۶

البتہ، جو اپنے پروردگار کی ہیبت سے ڈرے رہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

”قرآن اِس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے، وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور اُنھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی، بلکہ اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت ——— امت مسلمہ ——— کے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ جب قوموں نے اِس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اِس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ اِن نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی، بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی تو اُنھوں نے اِسی دین کے مزید مقتضیات نمایاں کیے۔ قرآن اِسی مبارک سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اُس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدم و نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اُس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۲۶)

۱۸۵۔ یہ لوگوں کو اُن کی بلادت پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنی رفاہیت، خوش حالی اور مال و اولاد کی ترقی سے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اُنھی پر مہربان ہے اور یہ اُن کی کامیابی کی دلیل ہے۔ فرمایا کہ یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ وہ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ یہ خدا کا استدراج ہے جو اُنھیں ہلاکت کے کھڈ میں گرا دے گا اور وہ اُس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔

يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا
وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ
وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ
بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا
عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾

ایمان رکھتے ہیں اور جو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہیں ٹھیراتے اور جو اُس کی راہ میں دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں، اِس طرح دیتے ہیں کہ اُن کے دل (اِس خیال سے) کانپتے ہیں کہ اُنھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے، وہی ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ اُن کو پا کر رہیں گے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[١٨٦] اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بالکل ٹھیک بتادے گی (کہ وہ دنیا میں کیا عمل کرتے رہے) اور اُن کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ۵۷-۶۲

نہیں، (یہ منکرین اِس کو نہیں سمجھتے)، بلکہ اِن کے دل اِس سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور (یہی نہیں)، اِن کے مشاغل اِس کے سوا ہیں، یہ اُنھی میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ جب اِن کے خوش حالوں کو ہم عذاب میں پکڑ لیں گے تو یہ فریاد کرنے لگیں گے[١٨٧] ـــــ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۸۶۔ یعنی اپنے بندوں سے جن صفات کا حامل بن کر جینے کا تقاضا کرتے ہیں، وہ اُن کی مقدرت سے باہر نہیں ہوتیں۔ ہم نے ہر انسان کو اِس کی طاقت دے کر پیدا کیا ہے کہ امتحان کی دنیا میں وہ اِن صفات کا حامل بن کر زندگی بسر کر سکے اور اِس کے نتیجے میں اپنے استحقاق کی بنیاد پر خدا کی ابدی جنت کا وارث بنے۔

۱۸۷۔ اِس لیے کہ عذاب اصلاً اُن مترفین ہی کے لیے آتا ہے جو اپنی دولت اور اقتدار کے غرور میں پیغمبر کی تکذیب کرتے ہیں، لیکن اِس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی لازماً آجاتے ہیں جو اُن کے اثر و رسوخ کی وجہ سے

لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ قف اِنَّکُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ کَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ
فَکُنْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ تَنْکِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَکْبِرِیْنَ ق بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

اب آہ و فریاد نہ کرو، ہماری طرف سے اب تمھاری کوئی مدد نہ ہو گی۔ میری آیتیں تمھیں سنائی جاتی تھیں تو تم پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہوئے اُس سے تکبر کر کے[188] الٹے پاؤں بھاگتے تھے، گویا کسی قصہ گو کو چھوڑ رہے ہو[189]۔ ۶۳-۶۷

آخر وقت تک اُنھی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔

۱۸۸۔ اصل میں 'مُسْتَکْبِرِیْنَ بِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع پیغمبر ہے جس کی تلاوت آیات پیچھے مذکور ہے اور 'ب' اِس بات کا قرینہ ہے کہ اِس میں استہزا کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ پیغمبر کے مقابلے میں یہی استہزا اور تکبر ہے جس کے عواقب پوری سورہ میں زیر بحث ہیں۔ اِس لیے یہ مرجع فحواے کلام سے صاف متبادر ہے۔

۱۸۹۔ اصل میں 'سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'سٰمِرًا' ہمارے نزدیک 'تَهْجُرُوْنَ' کا مفعول ہے جو مقدم ہو گیا ہے۔ یعنی ایک ایسے شخص کو چھوڑ رہے ہو جس کی بات کسی توجہ کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ کئی جگہ مذکور ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ کچھ نہیں، یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں: 'اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ'۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

قرآن و سنت کا باہمی تعلق

اصولی مواقف کا ایک علمی جائزہ

(۹)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نسخ القرآن بالسنۃ کے حوالے سے جمہور اصولیین کا موقف

امام شافعی کے موقف کا محوری نکتہ یہ تھا کہ سنت کا وظیفہ چونکہ قرآن مجید کی تبیین ہے اور اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی رہنمائی میسر تھی، اس لیے مراد الٰہی کے فہم میں سنت میں وارد توضیحات نہ صرف حتمی اور فیصلہ کن ہیں، بلکہ قرآن اور سنت کی دلالت میں کسی ظاہری تفاوت کی صورت میں انھیں قرآن کی تبیین ہی تصور کرنا ضروری ہے، یعنی انھیں اصل حکم میں تغییر یا اس کا نسخ نہیں مانا جائے گا، بلکہ قرآن کی ظاہری دلالت کو اسی مفہوم پر محمول کرنا ضروری ہوگا جو احادیث میں بیان کی گئی تفصیل و توضیح سے ہم آہنگ ہو۔

حنفی اصولیین نے اس پر یہ تنقید کی کہ اس نقطۂ نظر میں قرآن کے ظاہراً واضح اور غیر محتمل احکام میں اور محتمل و قابل تفصیل احکام میں فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا اور دونوں طرح کے احکام کو ایک ہی درجے میں رکھ کر، سنت میں وارد تخصیص کو 'بیان' شمار کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں قرآن کی اپنی دلالت ثانوی، غیر اہم اور مطلقاً خارجی توضیح و تشریح پر منحصر قرار پاتی ہے۔ چنانچہ حنفی اصولیین نے بیان کی مختلف صورتوں، تخصیص اور نسخ کا

مفہوم اور ان کا باہمی امتیاز واضح کرنے پر بطور خاص توجہ دی اور اس بنیادی موقف کو محکم بنانے کی کوشش کی کہ خود قرآن کے اپنے متن کی داخلی قطعیت اور وضوح یا ظنیت واحتمال کو نظر انداز کرتے ہوئے مطلقاً ہر طرح کے عمومات کو 'محتمل البیان' قرار دینا درست نہیں اور یہ کہ احادیث میں وارد تمام تخصیصات کو بھی سادہ طور پر محض 'بیان' اور 'وضاحت' قرار دینا علمی و عقلی طور پر ایک کم زور بات ہے۔

امام طحاوی اور ابن حزم کے نقطۂ نظر کے مطالعہ کے ضمن میں ہم نے دیکھا کہ قرآن وسنت کے باہمی تعلق کی بحث اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنی سادہ نہیں ہے کہ امام شافعی اور حنفی اصولیین میں سے کسی ایک کے رجحان کے مقابلے میں دوسرے رجحان کو فیصلہ کن اور قطعی انداز میں ترجیح دی جا سکے۔ دونوں زاویوں میں ایک منطقی وزن موجود ہے جو علمی و عقلی طور پر متاثر کرتا ہے اور بحث کو سنجیدگی اور گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرنے والے اکابر اہل علم دونوں کے وزن کو محسوس کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام طحاوی اور ابن حزم، دونوں نے امام شافعی کے اصولی نقطۂ نظر سے ہم دردی رکھتے ہوئے بھی، ان کے اس موقف کی کم زوری کو محسوس کیا کہ حدیث کو قرآن کا 'بیان' قرار دے کر قرآن کے ظاہری مفہوم کو ہر ہر مثال میں حدیث میں وارد حکم پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے متعدد مثالوں میں امام شافعی کے اس زاویۂ نظر سے اختلاف کیا اور اس کے بجائے قرآن کی ظاہری دلالت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مختلف توجیہ کے ذریعے سے حدیث کو قرآن کے ساتھ متعلق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ابن حزم نے سنت کے ذریعے سے قرآن کے نسخ کے جواز کے حوالے سے احناف سے اتفاق کرتے ہوئے امام شافعی کے موقف پر سخت تنقید کی اور حنفی اصولیین کے اس استدلال کا وزن تسلیم کیا کہ نصوص کے باہمی تعلق میں زمانی تقدم یا تاخر کے سوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کسی نص میں مذکور حکم پر زیادت یا اس میں تخصیص کو 'بیان' قرار دینے کے لیے اس کا زمانی لحاظ سے اصل حکم کے مقارن ہونا ضروری ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر ابن حزم کے ہاں اس الجھن کا بھی واضح احساس دکھائی دیتا ہے کہ دونوں نصوص کے زمانی طور پر مقارن ہونے کی صورت میں حکم کا ایک حصہ وحی متلو میں اور دوسرا غیر متلو میں نازل کرنے کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

دونوں طرف کے زاویۂ نظر اور استدلال میں وزن محسوس کرنے کا یہی رجحان ہمیں بعض شافعی اہل علم کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے جس کی کچھ توضیح ان سطور میں پیش کی جا رہی ہے۔

احناف کا استدلال یہ تھا کہ قرآن کے جن بیانات کی اپنی دلالت قطعی اور حتمی نہیں، بلکہ وہ توضیح وتفصیل کا

احتمال رکھتے ہیں، ان سے متعلق تو سنت میں وارد توضیح کو تبیین قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جو احکام اپنے مفہوم اور دلالت میں بالکل واضح ہیں اور مزید کسی تشریح و تبیین کا احتمال نہیں رکھتے اور بظاہر کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جو ان کے ظاہری مفہوم کے مراد نہ ہونے پر دلالت کرتا ہو تو ان سے متعلق سنت میں وارد تفصیلات کو علی الاطلاق تبیین نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ متعلقہ احادیث کے، زمانی لحاظ سے قرآن میں نازل ہونے والے حکم کے مقارن ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق کی جائے اور اگر دلائل وقرائن سے دونوں حکموں کا مقارن ہونا ثابت ہو جائے تو درست، ورنہ اسے لامحالہ ''تغییر'' اور ''نسخ'' قرار دیا جائے گا اور ایسی احادیث کو اسی صورت میں قبول کیا جائے گا جب وہ شہرت واستفاضہ سے ثابت ہوں یا انھیں امت کے اہل علم کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہو۔ تبیین اور تغییر میں فرق کے لیے اصل حکم اور تخصیص کے مقارن ہونے کی بحث اس نکتے پر مبنی تھی کہ آیا 'تأخیر البیان من وقت الحاجة' جائز ہے یا نہیں؟ حنفی اصولیین کا موقف یہ تھا کہ کلام میں اگر کوئی استثنا یا تخصیص متکلم کی مراد ہے تو اسے اصل کلام کے ساتھ ہی بیان ہونا چاہیے، کیونکہ پورا مدعا اس کے ساتھ ہی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مدعا کے کچھ حصے کی وضاحت کو موخر کر دینا عقلاً درست نہیں۔ اگر متکلم ایسا کرے تو موخر کلام کے ذریعے سے بیان کیے جانے والے استثنا یا تخصیص کی نوعیت بیان کی نہیں، بلکہ تغییر اور نسخ کی ہو گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جمہور اصولیین نے اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کیا کہ کلام میں جو استثنا یا تخصیص متکلم کی مراد ہے، اسے وقت حاجت سے موخر کرنا تو درست نہیں، لیکن ضروری نہیں کہ اسے لازماً اصل کلام میں ہی بیان کیا جائے۔ اس کے بجائے اگر اس وضاحت کو اس وقت تک موخر کیا جائے جب حکم پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں عقلاً کوئی مانع نہیں۔ جمہور اصولیین نے کہا کہ بعض دفعہ حکمت کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی حکم کو اصولی اور عمومی انداز میں ہی بیان کیا جائے اور متکلم کا مقصود ہی یہ ہو کہ سننے والے اسے صرف اصولی طور پر ذہن نشین کر لیں، کیونکہ اس سے متعلق تفصیلات کو پہلے مرحلے پر بیان کرنا خلاف مصلحت ہو سکتا ہے (الجوینی، البرہان ۱۶۷)۔

ابن حزم لکھتے ہیں کہ شریعت میں اس کی کئی نمایاں مثالیں موجود ہیں کہ ایک وقت تک کسی حکم کے اصولی بیان پر اکتفا کی گئی اور پھر حسب مصلحت مناسب اوقات میں اس کی جزئیات وتفصیلات بیان کی جاتی رہیں۔ مثلاً شراب سے متعلق ابتداءً قرآن میں ناپسندیدگی کے اشارات نازل کیے گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں

سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اشارے کو سمجھیں اور جس کے پاس شراب ہو، وہ اسے بیچ دے۔ پھر جب وہ وقت آیا جس میں شراب سے کلی اجتناب کا حکم دینا مقصود تھا تو اصل حکم بیان کر دیا گیا۔ اسی طرح حج کی فرضیت کا حکم بہت پہلے نازل کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے مناسک کی حتمی تفصیل و توضیح کو موخر رکھا گیا تا آنکہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس کی وضاحت فرما دی (الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۸۹-۹۰)۔

جمہور اصولیین نے یہ بھی کہا کہ ایک مسئلے کی جملہ تفصیلات کو ایک ہی نص میں بیان کرنا عقلاً لازم نہیں۔ حکم کے مختلف پہلوؤں اور جزئیات و تفصیلات کو حسب ضرورت مختلف مواقع پر بیان کیا جا سکتا ہے، اس لیے اگر متاخر اور منفصل کلام کے ذریعے سے کسی حکم کی بعض قیود و شرائط یا استثنا و تخصیص کو واضح کیا جائے تو اس سے بیان کی حقیقت پر کوئی زد نہیں پڑتی اور اسے 'نسخ' سے تعبیر کرنا غیر ضروری ہے۔ امام الحرمین الجوینی اس نوعیت کی تخصیصات کے حوالے سے سنت کے عمومی اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إنا على اضطرار من عقولنا نعلم أن الاحكام التي اقتضتها الصيغ مطلقة ثم فصلتها سنن الرسول صلى الله عليه وسلم على ممر الزمان عند اعتقاب الوقائع كثيرة، ومن أنكر ذلك وادعى أنه لم يرد خطاب مقتضاه عموم في الكتاب إلا فصله رسول الله صلى الله عليه وسلم على اثر مورده فقد ادعى أمرًا منكرًا وقال بهتانًا وزورًا، ومما نضربه مثالاً آية السرقة، فإنها إذ وردت لم يبتدر رسول الله صلى الله عليه وسلم تفصيل أحكامها في الأقدار والأحراز ونصاب المسروق في مجلس واحد، بل كان لا يعتنى بالأكباب على

''بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ ایسے احکام جن کا (قرآن میں) صرف اصولی طور پر ذکر کیا گیا اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف واقعات پیش آنے پر ان کی تفصیلات بیان کیں، بہت سے ہیں۔ جو شخص اس کا انکار کرتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا حکم وارد نہیں ہوا جو (بظاہر) عموم کا مقتضی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وارد ہونے کے فوراً بعد اس (میں موجود تخصیصات) کی وضاحت نہ کی ہو تو اس کا دعویٰ بہت ہی عجیب ہے اور وہ ایک بالکل جھوٹی اور بے بنیاد بات کہتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ہم آیت سرقہ کا ذکر کر سکتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال مسروقہ کی مقدار، حرز اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

البیان اعتناءہ بوظائف النقل فضلاً عن المفترضات، وکان إذا وقعت واقعة روجع فیھا فیبین قدر الغرض ویقتصد، وجاحد ذلک مباھت معاند.

(البرہان ۴۰۵-۴۰۶)

نصاب وغیرہ کی تفصیلات اس کے نزول کے متصل بعد ایک ہی مجلس میں بیان نہیں فرما دیں۔ آپ جتنی توجہ (احکام شرعیہ کو امت تک) منتقل کرنے پر دیتے تھے، اتنی توجہ ان کی (جزئیات و تفصیلات) وضاحت پر نہیں دیتے تھے، چہ جائیکہ فرضی تفصیلات کے درپے ہوں، بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آتا جس میں آپ سے رجوع کیا جاتا تو آپ بقدر ضرورت اس کی مناسب وضاحت فرما دیتے تھے۔ اس کا انکار کرنے والا کوئی ضدی اور معاند ہی ہو سکتا ہے۔''

دوسرے مقام پر مزید مثالوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إن الرب تعالیٰ ذکر الرقبة مطلقة وذکر الطعام والکسوة علی الإطلاق، ولم یتعرض لتفصیلھا وإنما استاقھا استیاقا لا یشتمل علی التزام البیان والتفصیل، کما جری ذلک في قوله تعالیٰ ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ'' وقوله تعالیٰ ''اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ'' وقوله تعالیٰ ''فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ''، فھذہ الآي لتأصیل الأصول ولا یمتنع أن یقع البیان في التفاصیل بعد استفادة التأصیل.(البرہان ۴۳۸)

''اللہ تعالیٰ نے (قسم کے کفارے میں) غلام کا اور اسی طرح (مسکینوں کو) کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے کا ذکر مطلقاً فرمایا ہے اور تفصیلات سے تعرض نہیں کیا، کیونکہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے ذکر ہی ایسے زاویے سے کیا ہے جس میں تفصیلات اور جزئیات کا بیان ضروری نہیں۔ یہی اسلوب اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ' اور 'اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ' اور 'فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ' میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ یہ آیات ایک اصولی حکم کے بیان کے لیے ہیں اور اصول کے واضح ہو جانے کے بعد تفصیلات کی وضاحت (اگلے مرحلے پر کیے جانے) میں کوئی رکاوٹ نہیں۔''

تاہم شافعی فقہا اور اصولیین کے ہاں اس نکتے کا بھی گہرا ادراک دکھائی دیتا ہے کہ اصولی حکم کے بیان پر اکتفا اور جزوی تفصیلات سے عدم تعرض کے مذکورہ ضابطے کا اطلاق بعض مثالوں میں (جیساکہ سرقہ کی مقدار، حرز

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اور نصاب وغیرہ کی بحث میں) اگرچہ بہت معقول اور موثر دکھائی دیتا ہے، لیکن بہت سی دیگر مثالوں کی توجیہ اس اصول کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔ اس حوالے سے خاص طور پر حسب ذیل تین مثالوں کا مطالعہ مفید ہو گا:

۱۔ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۲۴ میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے حرام خواتین کی ایک فہرست ذکر کرنے کے بعد آخر میں 'وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ' سے باقی تمام خواتین کے ساتھ نکاح کی اباحت بیان فرمائی ہے، جب کہ احادیث میں جمع بین الاختین کے علاوہ پھوپھی اور خالہ کے ساتھ بھتیجی اور بھانجی کو بھی ایک آدمی کے نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ امام شافعی نے یہاں یہ استدلال پیش کیا کہ کسی نص میں اگر کسی امر کی اباحت بیان کی گئی ہو تو وہ عقلاً اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہے کہ شارع نے دوسرے نصوص میں اس اباحت پر جو قدغنیں عائد کی ہیں، وہ بھی مراد ہیں اور انھیں ملحوظ رکھتے ہوئے ہی حکم کی تعبیر کی جائے گی۔ مثلاً زیر بحث اباحت چار بیویوں کی تحدید کے ساتھ مشروط ہے جو یہاں مذکور نہیں، بلکہ دوسرے نصوص میں بیان کی گئی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ حدیث میں پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو ایک آدمی کے نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کی جو ممانعت بیان کی گئی ہے، اس کی نوعیت بھی یہی ہے اور گویا 'وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ' میں ہی اصولی طور پر یہ مضمر ہے کہ یہ صورت بھی محرمات نکاح میں داخل ہے (الام ۱/ ۸۸، ۱۰۰۔ ۶/ ۱۲، ۳۹۰)۔

اس استدلال میں بہت بنیادی نوعیت کی کم زوری پائی جاتی ہے۔ امام صاحب یہاں یہ نظر انداز کر رہے ہیں کہ کسی بھی نص میں حکم کے ایک خاص پہلو کا بیان اصلاً مقصود ہوتا ہے جسے علماے اصول 'ما سیق له الکلام' سے تعبیر کرتے ہیں۔ حکم کے کچھ دوسرے پہلو دیگر نصوص کا موضوع ہو سکتے ہیں، لیکن وہ خاص پہلو جس کا بیان کسی نص میں مقصود ہے، اسے مکمل اور غیر محتمل ہونا چاہیے، چاہے دوسرے پہلوؤں کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا جائے۔ مثلاً زیر بحث آیت کا اصل موضوع ان رشتوں کی وضاحت ہے جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ آیت میں اس کی ایک پوری فہرست ذکر کر کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ان عورتوں کے علاوہ باقی سب عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں۔ اگر یہ فہرست مکمل نہیں اور اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ ان کے علاوہ کچھ مزید رشتے بھی محرمات کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں جن کا ذکر دیگر نصوص میں تلاش کرنا چاہیے تو سرے سے 'اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ' کی تصریح کی کوئی معنویت ہی باقی نہیں رہتی۔ امام صاحب نے اس اجازت کے

www.al-mawrid.org www.javedahmedghamidi.com

چار بیویوں کی تحدید سے مشروط ہونے کی جو مثال پیش کی ہے، وہ بالکل غیر متعلق ہے، کیونکہ بیویوں کی تعداد ایک الگ اور مستقل مسئلہ ہے جو اس آیت میں سرے سے زیر بحث ہی نہیں۔ اس لیے اس کے یہاں مذکور نہ ہونے سے یہ اخذ کرنا منطقی طور پر درست نہیں کہ اسلوب کلام اپنی ظاہری دلالت کے لحاظ سے محرمات کی مذکورہ فہرست میں بھی کسی اضافے سے مانع نہیں۔

امام شافعی کا پیدا کردہ یہ خلط مبحث شافعی اصولیین پر مخفی نہیں رہ سکا، چنانچہ امام الکیا الہراسی کو اس بحث میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ پھوپھی اور خالہ کے ساتھ بھتیجی اور بھانجی کو جمع کرنے کی حرمت اگر اس آیت سے موخر ہے تو اسے نسخ پر ہی محمول کرنا ممکن ہے، اسے تخصیص نہیں کہا جا سکتا۔ لکھتے ہیں:

واعلم أن المنصوص على تحريمه في كتاب الله تعالىٰ هو الجمع بين الأختين، وقد وردت آثار متواترة في النهي عن الجمع بين المرأة وعمتها أو خالتها ... والأخبار في تحريم الجمع بين العمتين والخالتين، إن كانت مقرونة في بيان رسول الله صلى الله عليه وسلم ببيان الآية فتخصيص، وإن تقدم الخبر فقوله ''وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ'' منزل على موجب الخصوص، وإن تراخى فنسخ وللناس في الكتاب بأخبار الآحاد كلام والصحيح جوازه.

(احکام القرآن ۱/ ۴۰۴-۴۰۵)

''جان لو کہ کتاب اللہ میں نصاً جس بات کی تحریم آئی ہے، وہ دو بہنوں کو ایک آدمی کے نکاح میں جمع کرنا ہے، تاہم متواتر احادیث میں پھوپھی اور خالہ کے ساتھ بھتیجی اور بھانجی کو بھی ایک آدمی کے نکاح میں جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث میں کتاب اللہ کی آیت کے ساتھ متصلاً اس حرمت کو بیان کر دیا گیا ہو تو یہ تخصیص ہو گی، لیکن اگر احادیث اس آیت سے مقدم ہوں تو پھر 'وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ' کی اباحت اس سابقہ ممانعت پر مبنی ہو گی، (یعنی یہ ممانعت اس اباحت سے مستثنیٰ سمجھی جائے گی)۔ اسی طرح اگر یہ احادیث اس آیت سے موخر ہوں تو پھر یہ نسخ ہو گا۔ اہل علم کا اخبار آحاد کے ذریعے سے کتاب اللہ کے نسخ میں کافی اختلاف ہے، لیکن درست بات یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔''

۲۔ سورۂ نور میں زانی مرد اور عورت، دونوں کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا ہے (النور ۲۴: ۲)۔ امام شافعی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فرماتے ہیں کہ یہاں بظاہر اگرچہ عموم کا اسلوب ہے جو ہر طرح کے زانیوں کو شامل ہے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں سو کوڑوں کی سزا جن زانیوں کے لیے بیان کی گئی ہے، اس سے مراد صرف غیر شادی شدہ زانی ہیں (الام ۱/ ۳۰، ۵۶)۔

اس مثال میں بھی امام شافعی کے طرز استدلال پر، ان کے اصولی نقطۂ نظر سے ہم دردی یا اتفاق رکھنے والے بہت سے اہل علم نے اطمینان محسوس نہیں کیا۔ چنانچہ ابن حزم نے اس راے پر سخت تنقید کی اور لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں زانی کے شادی شدہ یا غیر شادی ہونے کی کوئی تخصیص بیان نہیں کی، اس لیے یہ حکم تمام زانیوں کے لیے عام ہے اور شادی شدہ زانی بھی کوڑوں کی سزا کے حق دار ہیں (احکام الاحکام ۴/ ۱۱۲)۔

جلیل القدر شافعی فقیہ امام الکیا الہراسی نے بھی آیت نور کے دائرۂ اطلاق کو غیر شادی شدہ تک محدود ماننے کی توجیہ پر سخت تنقید کی ہے۔ الہراسی لکھتے ہیں کہ کسی حکم کے ظاہری عموم میں بعض جزوی اور استثنائی صورتوں کو شامل نہ سمجھنا تو درست ہو سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ نص دراصل انھی صورتوں سے تعرض کرتی ہے جو عموماً پیش آتی ہیں، چنانچہ کسی استثنائی اور نادر صورت کا حکم اگر اس سے مختلف ہو تو اس کا ذکر نہ کرنے سے نص کی دلالت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر کسی مسئلے کی عام الوقوع اور عمومی صورتیں ایک سے زیادہ اور مختلف ہوں اور ان میں سے صرف ایک صورت کا حکم بیان کرنا مقصود ہو تو پھر نص میں اس کی تصریح ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور حکم، کسی توضیح کے بغیر، عموم کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہو تو اس صورت میں عدم تعرض کی مذکورہ توجیہ کارگر نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ وہ صرف استثنائی اور نادر صورتوں سے متعلق درست ہو سکتی ہے۔ الہراسی لکھتے ہیں کہ زانی جیسے کنوارے ہو سکتے ہیں، اسی طرح شادی شدہ بھی ہو سکتے ہیں، بلکہ شادی شدہ لوگوں میں زنا کے ارتکاب کی مثالیں زیادہ پیش آتی ہیں، اس لیے یہ بات معقول نہیں ہو سکتی کہ 'اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ' سے مراد تو صرف کنوارے زانی ہوں، لیکن حکم کو عموم کے اسلوب میں بیان کر دیا جائے۔ اس ساری بحث سے الکیا الہراسی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت میں لازماً ہر طرح کے زانی مراد ہیں اور اگر احادیث میں شادی شدہ زانی کے لیے اس سے مختلف کوئی حکم بیان ہوا ہے تو اسے تخصیص، یعنی آیت کا بیان قرار دینا ممکن نہیں اور یہ کہ نسخ کے اصول کے علاوہ اس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی (احکام القرآن ۲/ ۲۹۰-۲۹۱)۔

۳۔ قرآن مجید میں حرام جانوروں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حرمت کو صرف چار چیزوں، یعنی مردار، دم مسفوح، خنزیر اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانور میں محصور قرار دیا گیا ہے (البقرہ ۲: ۱۷۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الانعام ۶: ۱۴۵)۔ تاہم احادیث میں ان چار کے علاوہ بھی بہت سے جانوروں کی حرمت کا حکم بیان ہوا ہے۔

اس کی توجیہ میں فقہا کے ایک گروہ کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ حدیث میں بیان ہونے والے احکام کو قرآن کے حکم کی تنسیخ یا اس میں ترمیم نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ شریعت کے ورود سے قبل تمام اشیا اباحت اصلیہ کے اصول پر حلال تھیں۔ قرآن مجید نے ان میں سے چار چیزوں کو تو حرام قرار دیا ہے، لیکن باقی چیزوں کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں فرمایا۔ گویا باقی اشیا مسکوت عنہ تھیں اور اباحت اصلیہ کے اصول پر ان سے استمتاع جائز تھا۔ پھر احادیث میں اسی اباحت اصلیہ کے دائرے میں آنے والے بعض جانوروں کو حرام قرار دیا گیا۔ چونکہ قرآن ان کے بارے میں خاموش تھا، اس لیے حدیث کے احکام کو قرآن کے حکم کی تنسیخ یا ترمیم نہیں کہا جا سکتا۔

امام رازی اس استدلال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أنه لما ثبت بمقتضى هاتين الآيتين حصر المحرمات في هذه الأربعة كان هذا اعترافا بحل ما سواها، فالقول بتحريم شيء خامس يكون نسخًا. (تفسیر الرازی ۱۳/ ۲۳۳)

”جب ان دو آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں تو یہ اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے علاوہ باقی چیزیں حلال ہیں، اس لیے چار کے علاوہ کسی پانچویں چیز کو حرام قرار دینا لازماً نسخ ہے۔“

اسی طرح بعض فقہا نے حدیث میں وارد محرمات کو تخصیص کے اصول پر قرآن کے حکم کے ساتھ ملحق کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام رازی نے اس استدلال کی کمزوری بھی واضح کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

نقول: ليس هذا من باب التخصيص بل هو صريح النسخ لأن قوله تعالىٰ ”قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ“ مبالغة في أنه لا يحرم سوى هذه الأربعة ... فالقول بأنه ليس الأمر كذلك يكون دفعًا لهذا الذي ثبت بمقتضى هاتين الآيتين. (ایضاً ۱۳/ ۲۳۳)

”ہم کہتے ہیں کہ یہ تخصیص کی قبیل سے نہیں ہے، بلکہ صریح نسخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ“ نہایت موکد اسلوب میں یہ بیان کر رہا ہے کہ ان چار چیزوں کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں، اس لیے یہ کہنا کہ ایسا نہیں ہے (اور ان کے علاوہ اور چیزیں بھی حرام ہیں) ان دونوں آیتوں سے ثابت ہونے والے حکم کو رد کرنا ہے۔“

اس نوعیت کی مشکلات کے تناظر میں جمہور اصولیین، جن کی اکثریت فقہ شافعی کی طرف انتساب رکھتی ہے، نسخ کی بحث میں بتدریج اس نقطۂ نظر سے متفق ہوتے چلے گئے کہ سنت کے ذریعے سے جیسے قرآن کے احکام کی تبیین و تخصیص کی جا سکتی ہے، اسی طرح حکم کا نسخ بھی ثابت ہو سکتا ہے اور یہ کہ تخصیص و زیادت کی تمام صورتوں کو تکلفاً تبیین پر محمول کرنے کے بجاے مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے بعض صورتوں کو نسخ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

امام الحرمین اس بحث کا محاکمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے تو حتمی طور پر یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سنت کے ذریعے سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں کیا جا سکتا، لیکن متکلمین نے یہ قرار دیا ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں اور یہی بات واضح طور پر درست ہے۔ امام الحرمین کہتے ہیں کہ اصل نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے کسی حکم کو پیغمبر ازخود منسوخ نہیں کر سکتا اور نسخ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دوسرا حکم آئے، لیکن نئے حکم کا ابلاغ ضروری نہیں کہ قرآن ہی میں کیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت کسی بھی صورت میں اس کا ابلاغ فرما سکتے ہیں (البرہان ۲/ ۱۳۰۷)۔ امام الحرمین کے بعد جمہور متکلمین کے طریقے پر لکھی گئی اصول فقہ کی امہات میں بالعموم یہی موقف اختیار کیا گیا ہے اور آمدی، غزالی، رازی اور زرکشی جیسے محققین نے بھی اسی کی تصویب کی ہے (الاحکام فی اصول الاحکام ۳/ ۱۸۵-۱۹۷۔ المستصفی من علم الاصول ۲/ ۱۰۷-۱۰۸۔ المحصول فی علم اصول الفقہ ۳/ ۳۵۴-۳۴۷۔ البحر المحیط ۴/ ۱۰۹-۱۱۰)[1]۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ زرکشی نے اس بحث میں تفصیل سے اس اختلاف کو بھی واضح کیا ہے جو امام شافعی کے موقف کی توضیح و تعیین کے حوالے سے شافعی فقہا کے مابین پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک امام شافعی فی الواقع سنت کے ذریعے سے قرآن کے نسخ کے جواز کے قائل نہیں، جب کہ دوسرے گروہ کے نزدیک امام شافعی کے نقطۂ نظر کو اس کے درست سیاق و سباق میں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے (دیکھیے: البحر المحیط ۴/ ۱۱۰-۱۱۶)۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

قومیت بطور مذہب

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زیر نظر مضمون کارلٹن جے ایچ ہیز (۱۹۶۴ء - ۱۸۸۲ء ,Carlton J H Hayes) کے آرٹیکل، ''Nationalism as a Religion'' کے ماڈل کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کارلٹن ایک امریکی مؤرخ تھا۔ ایک وقت میں وہ تصور قومیت کا حامی رہا، پھر اس کے خیالات اس بارے میں مکمل طور پر تبدیل ہو گئے۔ اپنے دور میں قومیت کے نام پر برپا ہونے والی دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے قومیت کے تصور میں موجود منفیت اور مقامیت کا ادراک کیا اور اس کے نہایت شان دار تجزیے پیش کیے۔ اس نے قومیت کو تاریخ انسانی کی بدترین برائیوں میں سے ایک شمار کیا۔

قومیت کا تعارف

اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ تعلق اور عصبیت کا احساس قدیم اور فطری احساس ہے۔ لیکن یہ تصور کہ ایک خاص جغرافیہ میں رہایش پذیر انسانوں کا گروہ ایک قوم ہے، ان پر حق حکمرانی ان کے ہم قوم کو ہی حاصل ہے اور یہ ایک مقدس تصور ہے، جس کی خاطر انسانی جان سمیت کوئی بھی قربانی دی اور لی جا سکتی ہے اور دوسرے انسانوں کی جان و مال کو پامال کیا جا سکتا ہے، یہ قومیت اور قومی ریاست کا عقیدہ ہے، جس پر ایمان لانا ایک وفادار شہری کے لیے لازم تصور کیا گیا ہے۔ مغرب سے درآمد ہونے والا قومیت کا یہ سیاسی تصور ہے۔

مضمون کا متن

انسان مذہب چھوڑ سکتا ہے، لیکن مذہبی حس اس کو نہیں چھوڑتی۔ یہ مذہبی حس اعتقادات اور مقدسات کی طالب ہے جن کے لیے آدمی اپنی جان، مال اور اولاد سب قربان کر سکے۔ مذہبی اعتقادات نہ ملیں تو آدمی اپنے جیسے انسانوں کے وضع کردہ نظریات اور فلسفوں کے ساتھ ایسے ہی اعتقادات اور جذباتیت وابستہ کر لیتا ہے۔ مسیحیت نے یورپ میں آ کر قدیم مذہب کو تو بدلا، لیکن قدیم مذہبی تصورات، اعتقادات اور ان سے متعلق مقدس سمجھی جانے والی رسوم و رواج اور آداب کو اس نے اپنے اندر سمو لیا۔ اگلے مرحلے میں کیتھولزم پر پروٹسٹنٹ ازم کے ذریعے سے اعتراضات اور اصلاحات کا دروازہ تو کھلا، لیکن فرد کی مذہبی حس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ یہ مذہبی حس اب پروٹسٹنٹ ازم میں منتقل ہو گئی اور وہی جذباتی وابستگیوں کے مظاہرے یہاں بھی دیکھنے کو ملے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اٹھارھویں صدی کے یورپ میں تشکیک کا دور دورہ ہو گیا۔ لوگوں نے مذہب کو چیلنج کر دیا۔ مسیحیت کے عقائد کو عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھ کر رد کیا جانے لگا، مذہب کے ساتھ وابستہ اعتقادات اور عقیدتیں ماند پڑنے لگیں، لیکن اس کے مظاہر فرد سے پھر بھی جدا نہ ہوئے۔ یہ عقیدتیں اب تصور فطرت، سائنس، عقل اور انسانیت سے متعلق انسانی فلسفوں کی پجاری اور فدائی بن گئیں۔ مذہب کا رنگ ہلکا تو ہو رہا تھا، مگر مذہبی عقیدتوں کی عادت اب بھی گہری تھی جس نے اپنی تسکین کے لیے انسان ساختہ فلسفیانہ خداؤں کے ساتھ وابستگی پیدا کر لی تھی۔ ان کی تبلیغ اور دفاع میں وہی جذباتیت پائی گئی جو مذہب کے لیے پائی جاتی تھی۔

یہی وہ دور تھا جب فرد کی مذہبی حس، ریاست کے ساتھ بھی وابستہ ہو گئی۔ مذہبی عقیدوں اور عقیدتوں کا مذہب سے منتقل ہو کر انسان کے وضع کردہ فلسفوں کے ساتھ وابستہ ہو جانے کا یہ رجحان اٹھارھویں صدی کی خصوصیت ہے۔ انسان ساختہ خدا حسی تھے جن کی پوجا کرنے اور ان کی خاطر قربانیاں دینے کا نقد اور مادی فائدہ ملتا نظر آتا تھا، اپنے لیے نہیں تو اپنوں کے لیے۔

انقلاب فرانس نے قومیت کو مذہب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایبے رینل (Abbe Raynal) کہتا ہے کہ ریاست، مذہب کے لیے نہیں ہے، بلکہ مذہب، ریاست کے لیے ہے۔ (غور کیجیے تو یہ ڈاکٹرائین مولانا مودودی کے فلسفۂ سیاست و حکومت کا بھی ہے۔ ان کے نزدیک بھی دین کا مطمح نظر ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ گویا ان کے ہاں بھی دین، ریاست کے قیام کا ذریعہ ہے۔ انیسویں صدی میں قومیت کا جو صور پھونکا گیا،

مولانا مودودی کے ہاں وہ مذہب کے اسلوب میں ملتا ہے۔) فرانس میں کیتھولزم اور نیشنلزم کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ سول کانسٹیٹیوشن آف کلرجی (۱۷۹۰ء) پاس ہوا جس کے مطابق وہی پادری گرجے میں اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکتا تھا جو ریاست کے آئین کو تسلیم کرے۔ اس کا انکار کرنے والوں پر جبر کیا گیا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ قومیت کے نام پر جبر نے قومیت کو ایک مکمل مذہبی روپ دے دیا جہاں ایک فرد کو قومیت کے اس تصور کی بنا پر دوسرے انسانوں پر جبر کرنے اور اس کی جان لینے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا۔ ۱۷۹۱ء میں فرانس کا آئین منظور ہوا، جس نے اسے نہیں مانا، اسے آئین کا منکر قرار دے دیا گیا۔ آئین کے منظور ہونے کے بعد آئین کے صحیفے کو ہاتھ میں پکڑ کر سر اور سینے پر رکھ کر ایک جلوس نکالا گیا جو آئین کی تقدیس میں سر جھکائے، ادب و احترام سے آہستہ آہستہ سے چل رہا تھا، جب کہ راستے میں کھڑے دیگر افسران نے آئین کے احترام میں اپنے سروں سے ٹوپیاں اتار لیں۔ یہ مسیحی مذہبی رسوم تھیں جو اب آئین کی تقدیس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی تھیں۔

مذہب کے ساتھ وابستہ دیگر مذہبی مظاہر، جیسے بپتسمہ دینا یا اسلام میں کلمۂ شہادت ادا کرنے کے طرز پر قومیت سے وفادار رہنے کا حلف آ گیا، اسی بنا پر کسی دوسری قومیت میں داخل کرنے کے لیے پہلے فرد سے وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے؛ پھر مذہب سے انحراف کرنے کی جسارت کو ارتداد قرار دینے کے اصول پر قومیت سے انحراف کرنے کو غداری قرار دیا گیا، جس کی سزا، ارتداد کی سزا کی طرح موت مقرر کی گئی؛ بچے کے پیدا ہوتے ہی جیسے اس کے مذہب کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کا باقاعدہ اندراج کرایا جاتا ہے؛ اسی طرز پر اس کی قومیت کا فیصلہ بھی پیدایش کے ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے اور اس کا بھی اندراج کرایا جاتا ہے، چرچ اور مسجد جیسی مذہبی عمارات کے طرز پر قومی عمارتوں کی یادگاریں وجود میں لائی گئیں؛ مذہبی مظاہر کی طرح قومیت کے اظہار کے مظاہر مقرر کیے گئے، مثلاً، قومی جھنڈا اور قومی دن کی علامات مقرر کی گئیں؛ قومی مظاہر کی تقدیس کے اظہار کے لیے مذہب کی طرز پر مخصوص آداب اور اوقات بھی وضع کیے گئے، مثلاً قومی ترانہ بجتے وقت یا جھنڈا بلند کرتے وقت باادب کھڑا ہونا، سیلیوٹ کرنا، سینے پر ہاتھ رکھنا؛ مذہبی تہواروں کی طرح قومی دن منانے کی رسم کی طرح بھی ڈالی گئی؛ مذہب کی مقدس ہستیوں، رسولوں اور انبیا اور مذہبی بزرگوں کی طرح قومی ہیروز کی تقدیس اور احترام فرد پر واجب قرار دے دیا گیا جن پر تنقید بھی توہین قرار پائی؛ خدا کی حمد کی جگہ قومی ترانے اور حج جیسی مرکزی مذہبی رسم کے طرز پر قومی اجتماعات اور ان کے لیے مخصوص دن مقرر کیے گئے؛ مذہبی شعار کی بے حرمتی کے تصور کی بنیاد پر قومی شعار کی بے حرمتی بھی توہین کی طرح سخت قابل سزا جرم قرار پایا؛ مذہبی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خطبات کی جگہ قومی خطبات نے لے لی جو سیاسی اور فوجی زعما دیتے اور مذہبی خطبا کی طرح ہی عقل و منطق سے ہٹ کر محض جذبات کی اپیل کر کے لوگوں کا خون گرماتے ہیں۔ یوں قومیت اپنے تمام تر اعتقادات اور رسوم کے ساتھ ایک مکمل مذہب بن گئی۔

پوری ریاست قومیت کے خدا کی عبادت گاہ ہے، مسجد جس میں غیر قوم کے لوگ مسلمانوں کی اجازت کے بنا داخل نہیں ہو سکتے، اسی طرح دوسری قوم کے لوگ دوسرے قومی خدا کے پیرو کار ہیں، جو کسی دوسرے ملک میں ان لوگوں کی اجازت کے بنا اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ دوسری قومیت کے لوگ غیر ہیں جن کو اپنے قومی خدا کے چرنوں میں قربان کرنا پڑے تو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

قومیت کا مذہب نہ صرف عقیدت اور ایمان، بلکہ عقل و تصورات کو بھی اپنا غلام بنالیتا ہے۔ عقل عیار اس کے لیے تاویلات گھڑتی ہے، ایسے ہی جیسے مذہبی متکلمین مذہب کا دفاع کرنے کے لیے عقلی دلائل تلاشتے اور تراشتے ہیں۔

قومیت کے خدا کے ساتھ لوگ ایک رفاقت اور سرشاری محسوس کرتے ہیں، اسے اپنا محافظ سمجھتے ہیں، اس کو داتا اور رحم کرنے والا سمجھتے ہیں، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو ناراض کرنے سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ''دھرتی ماں'' اور ''ریاست ہو گی ماں کے جیسی'' جیسے تصورات اسی کا نتیجہ ہیں۔ ریاست کو مونث خدا سمجھنے کے پیچھے وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں خدا کے تصور میں دیویوں کا تصور قدیم سے موجود رہا ہے۔ قومی ریاست کی سرحدوں کی ابدیت کا تصور بھی مذہب قومیت کے اسی تصور کا ایک خاصہ ہے۔

مزید یہ کہ مذہبی کتاب کی جگہ آئین نے لے لی۔ تقدیس میں اس کا درجہ وہی ہے جو قرآن یا بائیبل کا ہے۔ اس میں قومیت کی تعریف اور تعیین درج کر دی جاتی ہے اور اس کے معیار پر افراد کو ریاست کا کافر یا مومن تصور کیا جاتا ہے۔ آئین کے فہم میں باہم اختلاف بھی ہو جاتا ہے، ایسے ہی جیسے قران مجید یا بائیبل کے متن کے فہم میں ہو جاتا ہے، لیکن اس کی تقدیس اٹل اور متفقہ ہی سمجھی جاتی ہے۔

قومیت کی خاطر جان دینا اتنا ہی مقدس فرض باور کرایا جاتا ہے، جتنا مذہب کی خاطر اور مرنے والے کو شہادت کا درجہ بھی مذہب سے ہی لے کر دیا گیا ہے۔

قومیت کے بت کی تقدیس کو قائم رکھنے کے لیے قوم کی تاریخ کو بھی تقدس کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔ قومی کوتاہیوں کو منہا کر کے تاریخ ایسے انداز میں پڑھائی جاتی ہے کہ وہ معصوم ہستیوں کی تاریخ کی طرح خطا سے پاک مقدس تاریخ بن جاتی ہے، جس پر ایمان لانا لازم ہوتا ہے اور اس پر سوال اٹھانا کفر کی طرح غداری سمجھا جاتا

ہے۔ نیز، عوامی شہرت رکھنے والی غیر مستند مذہبی روایات کی طرح ہی قومی روحانی غیر مستند روایات بھی گھڑی جاتی ہیں جنھیں عوام میں پھیلایا جاتا ہے، بلکہ خواب و مکاشفات کی پوری دیومالا اس کے لیے مرتب کی جاتی ہے۔ اسکولوں کالجوں کی نصاب سازی بھی تصور قومیت کے نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ کوئی ایسے حقائق اس میں شامل نہ ہوں جو قومیت کے مذہب یا اپنی قومیت کی تقدیس پر فرد کے ایمان کو متزلزل کر دے۔ قومی حق حکمرانی کے قیام اور اس کی بقا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے، اس کی بنیاد پر اپنی جان دینے اور دوسروں کی جان لینے کو قومی بیانیے کے طور پر بچپن سے ہی بچوں کے اذہان میں ڈالا جاتا ہے اور اس طرح ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ میڈیا اور صحافت کو اس کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ قومیت کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتے، ورنہ سزا اور جرمانہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

قومیت کے مذہب کا یہ کارنامہ ہے کہ بغیر کسی مابعد الطبیعیاتی تصور اور آخرت میں ابدی انعامات کے حصول کی یقین دہانی کے لیے فرد کو اپنی جان محض قومی تفاخر کے اظہار کے لیے قربان کر دینے پر راضی کر لیتی ہے۔ یہاں، اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے۔ قومیت اعلیٰ آفاقی اخلاقیات سے عاری ہے جو درحقیقت عصبیت کی ہی شکل ہے۔ قومیت، عصبیت کی طرح حق و ناحق نہیں دیکھتی، بلکہ ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے کو فرض قرار دیتی ہے۔ دین نے ہمیں یہ ہدایت دی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (النساء ۴: ۱۳۵)

”ایمان والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے، اگرچہ یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا زیادہ حق دار ہے (کہ اُس کے قانون کی پابندی کی جائے)۔ اِس لیے (اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر) تم خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ اِس کے نتیجے میں حق سے ہٹ جاؤ اور (یاد رکھو کہ) اگر (حق و انصاف کی بات کو) بگاڑنے یا (اُس سے) پہلو بچانے کی کوشش کرو گے تو اُس کی سزا لازماً پاؤ گے، اِس لیے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔“

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس سلسلے میں یہ ہیں:

''ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کوئی مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت اور نام وری کے لیے لڑتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، فرمایئے کہ ان میں سے کس کی لڑائی اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی تو صرف اس کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں اترے۔''

(بخاری، رقم ۲۸۱۰)

''وہ ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی دعوت دی، وہ ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی خاطر قتال کیا اور وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی حالت میں مر گیا۔'' (ابو داؤد، رقم ۵۱۲۱۔ مشکوٰۃ، رقم ۴۹۰۷)

''جو شخص اپنی قوم کی ناحق مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ کے مانند ہے جو کنویں میں گر گیا اور اس کی دم پکڑ کر اس کو نکالا جائے۔'' (ابو داؤد، رقم ۵۱۱۷۔ مشکوٰۃ، رقم ۴۹۰۴)

اس تصور قومیت کی تشکیل کے بعد سے لوگ میدان جنگ میں قومیت کے بت پر مسلسل قربان ہو رہے ہیں اور دوسرے انسانوں کو محض اس وجہ سے نفرت یا حقارت سے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے ہم قوم نہیں ہیں۔ محض اس بنا پر اپنے ملک کی کم معیاری یا غیر معیاری اشیا اور ادویات خرید لیتے ہیں کہ اس سے ان کی قومیت کا اظہار ہوتا ہے۔

قومیت ایک ایسا مذہب ہے کہ الہامی مذاہب کو ماننے والوں کے درمیان یا ایک الہامی مذہب کے مختلف فرقوں کے درمیان اگر نفرت اور چپقلش بھی پائی جاتی ہو تو قومیت کے مذہب میں آکر وہ سب متحد ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ قومیت اپنی نہایت میں اپنے اندر آفاقیت نہیں رکھتا۔ یہ انسانوں کو تقسیم کرنے اور انسانوں کے درمیان تفاخر، نفرت اور حقارت کا بیانیہ ہے۔

قومیت بطور مذہب کشادہ دلی یا عدل کا کوئی تصور پیدا نہیں کرتی۔ یہ مغرور ہے، متواضع نہیں۔ یہ انسانی اہداف کو عالم گیر نہیں ہونے دیتی۔ یہ کہتی ہے کہ دنیا میں بس یہود یا یونانی ہونے چاہییں، فرق صرف یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کے یہودی اور یونانی اب ہر جگہ موجود ہیں۔ قومی ریاست قبائلی عصبیت کا دوسرا نام ہے جس میں خود غرضی، خاص طرح کی جہالت اور جابر قسم کا عدم برداشت اور جنگی رجحان پایا جاتا ہے۔ قومیت امن نہیں جنگ کی خوگر ہے اور ہم اس سے آگے دیکھنے کی تجویز آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت علی رضی اللہ عنہ

(۹)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گورنروں کی واپسی اور حضرت معاویہ کو خط

حضرت سہل بن حنیف مدینہ لوٹ آئے تو حضرت علی کو حالات معلوم ہوئے۔ اس اثنا میں دوسرے گورنر بھی پلٹ آئے تھے۔ انھوں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو طلب کیا اور کہا: میں تمھیں جس چیز سے باخبر کرتا تھا، رونما ہو چکی ہے۔ گویا ایک آگ لگی ہے جو بڑھتی اور بھڑکتی جا رہی ہے۔ دونوں نے عرض کیا: ہمیں مدینہ سے نکلنے دیجیے تاکہ ہم کوئی تدبیر کریں۔ حضرت علی نے کہا: میں خود معاملات سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انھوں نے حضرت معاویہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خطوط لکھے۔ حضرت ابوموسیٰ نے جواب بھیجا کہ اہل کوفہ نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ انھوں نے خوش دلی سے بیعت کرنے والوں اور بہ اکراہ اطاعت کرنے والوں کی فہرست بھیجی۔ حضرت سبرہ بن معبد جہنی حضرت علی کا مکتوب لے کر حضرت معاویہ کے پاس گئے تھے۔ حضرت معاویہ نے انھیں کئی دن روکے رکھا۔ وہ جواب لکھوانے کو کہتے تو حضرت معاویہ رزمیہ اشعار سنانا شروع کر دیتے۔ سیدنا عثمان کی شہادت کو تیسرا مہینا لگا تو انھوں نے قبیصہ عبسی کو بلایا اور ایک سر بمہر دستہ دے

کر مدینہ روانہ کیا جس پر تحریر تھا: ''معاویہ کی طرف سے علی کو جواب''۔ حضرت سبرہ جہنی بھی ساتھ چلے۔ مدینہ پہنچنے پر قبیصہ نے حضرت معاویہ کی ہدایت کے مطابق بنڈل اٹھایا اور حاضرین مجلس کو دکھانا شروع کر دیا۔ لوگوں کو علم ہو گیا کہ حضرت معاویہ حضرت علی کی خلافت ماننے سے انکاری ہیں، اس لیے اٹھ کر جانا شروع ہو گئے۔ اب قبیصہ نے کاغذوں کا بنڈل حضرت علی کے حوالے کیا۔ انھوں نے مہر کھولی تو کوئی خط نہ نکلا۔ پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ قبیصہ نے پوچھا: مجھے امان ملے گی؟ حضرت علی نے کہا: قاصد کو قتل نہیں کیا جاتا۔ اس نے کہا: میں ایسی قوم کو چھوڑ کر آیا ہوں جو قصاص کے علاوہ کسی شے پر راضی نہیں۔ پوچھا: کس سے قصاص چاہتے ہیں؟ بتایا: آپ کے رشتۂ گردن سے۔ میں ساٹھ ہزار بزرگوں کو جامع دمشق کے منبر پر رکھی ہوئی عثمان کے قمیص کے نیچے روتا چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت علی نے کہا: مجھ سے عثمان کے خون بہا کا مطالبہ کر رہے ہو؟ کیا میں خود مظلوم نہیں جس کا بھائی عثمان شہید کر دیا گیا؟ اے اللہ، میں تیرے حضور عثمان کی شہادت سے براءت پیش کرتا ہوں۔

قتال کی تیاری اور اہل مدینہ کا طرز عمل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت معاویہ کے بیعت نہ کرنے کی صورت میں حضرت علی کیا اقدام کریں گے، کیا وہ ہم قبلہ مسلمانوں سے قتال کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ یہ دیکھنے کے لیے اہل مدینہ نے حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی کو بھیجا۔ وہ کچھ دیر ہی بیٹھے تھے کہ حضرت علی نے کہہ دیا: شام کے جہاد کی تیاری کرو۔ حضرت زیاد نے نرمی اور احسان کا مشورہ دیا تو حضرت علی نے کہا: تلوار اور سمجھ دار مددگار ساتھ ہوں تو ہی ظالم کو روکا جا سکتا ہے۔ حضرت زیاد باہر آئے تو لوگوں نے بے تابی سے پوچھا: کیا فیصلہ ہوا؟ تلوار، انھوں نے جواب دیا۔ حضرت علی کے صاحب زادے حضرت حسن پہلے ہی خاموش رہنے اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کا مشورہ دے چکے تھے۔

حضرت علی نے فوج تیار کرنا شروع کی۔ محمد بن حنفیہ کو علم سونپا، حضرت عبد اللہ بن عباس کو میمنہ پر، حضرت عمر بن ابو سلمہ (یا حضرت عمرو بن سفیان) کو میسرہ پر اور حضرت ابو عبیدہ کے بھتیجے ابو لیلیٰ بن عمر بن جراح کو ہراول دستے پر مامور کیا۔ حضرت عثمان کے خلاف خروج کرنے والے کسی شخص کو کوئی عہدہ نہ دیا۔ انھوں نے اپنے گورنروں حضرت قیس بن سعد، حضرت عثمان بن حنیف اور عہد عثمانی سے چلے آنے والے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری کو خط لکھے کہ لشکر تیار کر کے شام کی طرف روانہ کریں۔ پھر اہل مدینہ سے خطاب کیا: اللہ نے اپنے رسول کو قرآن مجید دے کر ہدایت دینے کے لیے بھیجا۔ بلا شبہ، بدعات و شبہات ہی ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں جو ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔ شاید

اللہ تمھارے ذریعے سے ان فسادات کو دور کر دے جو دنیا والوں نے برپا کر رکھے ہیں۔ جیش علی ابھی کوچ نہ کر پایا تھا کہ مکہ سے خبر آئی کہ سب لوگ مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضرت علی بولے: طلحہ و زبیر اور ام المومنین میری امارت کے درپے ہو کر لوگوں کو اصلاح کی طرف بلا رہے ہیں۔ میں صبر کروں گا جب تک تمھاری جماعت کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہوا۔ اگر انھوں نے جنگ نہ کی تو میں بھی گریز کروں گا اور ان کی باتیں سن کر صبر کروں گا۔ پھر خبر آئی کہ اہل مکہ بصرہ کی طرف چل پڑے ہیں۔ حضرت علی نے بھی بصرہ کا رخ کرنے کا حکم دیا۔

یہ اعلان مدینہ والوں پر شاق گزرا۔ حضرت علی نے حضرت عبداللہ بن عمر کو بلایا اور ساتھ چلنے کو کہا۔ انھوں نے کہا: اگر اہل مدینہ آپ کے ساتھ نکلے تو میں بھی چل پڑوں گا۔ حضرت علی نے کہا: مجھے ضمانت دو کہ مدینہ سے باہر نہیں جاؤ گے۔ انھوں نے کہا: میں کوئی ضامن نہیں دے سکتا۔ حضرت علی نے کہا: تم بچپن ہی سے بد اخلاق ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنی سوتیلی والدہ ام کلثوم بنت علی کو یہ بتا کر کہ اہل مدینہ کا اس قتال پر اطمینان نہیں ہے، اسی رات مدینہ سے نکل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ عمرہ کی نیت سے جا رہے ہیں اور بیعت علی پر قائم ہیں۔ صبح اٹھتے ہی حضرت علی کو بتایا گیا کہ معاویہ، طلحہ، زبیر اور ام المومنین کے حادثے سے بھی بڑا سانحہ پیش آ گیا ہے۔ عبداللہ بن عمر شام کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ حضرت علی فوراً بازار پہنچے اور حضرت عبداللہ کی تلاش میں سواریاں دوڑانے کا حکم دیا۔ ام کلثوم بنت علی کو علم ہوا تو فی الفور خچر منگوا کر حضرت علی کے پاس پہنچیں اور انھیں اصل واقعے سے مطلع کیا، تب یہ معاملہ ٹلا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اہل مدینہ کا رویہ دیکھ کر حضرت علی نے مدینہ کے سرکردہ افراد کو پھر بلا کر خطاب کیا: امر خلافت کی اب اصلاح اسی طرح ممکن ہے، جیسے ابتدا میں کی گئی تھی۔ ان کی نصرت خلافت کی دعوت پر محض دو انصاری صحابہ حضرت ابوہیثم بن تیہان اور حضرت خزیمہ بن ثابت نے لبیک کہا۔ حضرت زیاد بن حنظلہ نے دیکھا کہ مدینہ کے لوگوں نے جنگ کے معاملہ میں حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو انھوں نے ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ حضرت ابوقتادہ انصاری نے کہا: امیر المومنین، یہ تلوار مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمائل کی تھی۔ ایک عرصہ نیام میں رہنے کے بعد اسے ان ظالموں کے خلاف برہنہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ نے کہا: میرا نکلنا معصیت ہے، اس لیے میرا بیٹا عمر بن ابو سلمہ جو مجھے بہت عزیز ہے آپ کے ساتھ جائے گا اور تمام معرکوں میں حصہ لے گا۔ شعبی کہتے ہیں: صرف چار (یا چھ) بدری صحابہ نے اس فتنہ میں حضرت علی کا ساتھ دیا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۳۸)۔

حضرت عائشہ کی بصرہ روانگی

حضرت طلحہ و حضرت زبیر حضرت علی سے عمرہ پر جانے کی اجازت لے کر مکہ پہنچ چکے تھے۔ سیدہ عائشہ حج کے بعد مدینہ لوٹ رہی تھیں، سرف کے مقام پر ان کی ننھیال بنولیث کا شخص عبید بن ابو سلمہ ملا۔ انھوں نے مدینہ کے حالات دریافت کیے تو اس نے بتایا: عثمان شہید کر دیے گئے ہیں، لوگوں نے علی کی بیعت کر لی ہے اور چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا: مجھے تو یہ بیعت مکمل ہوئی نظر نہیں آتی۔ مجھے مکہ واپس لے چلو۔ عبید نے کہا: آپ ہی ان کے قتل کے فتوے دیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا: بلوائیوں نے توبہ کروا کر ان کو شہید کیا ہے۔ مسجد حرام کے دروازے پر اتر کر وہ حطیم میں داخل ہوئیں۔ لوگوں کا ٹھٹھ لگ گیا۔ حضرت عائشہ نے خطاب کیا: باغیوں نے وہ خون بہایا جس کا بہانا حرام تھا۔ حرام مہینے میں ایک محترم شہر کی حرمت پامال کی۔ ان فسادیوں کو سزا دینے کے لیے آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ عثمان کو مظلومی کی حالت میں شہید کیا گیا، میں ان کے قصاص کا مطالبہ کرتی ہوں۔ حضرت عائشہ کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے مکہ کے عثمانی گورنر عبداللہ بن عمرو حضرمی تھے۔ حضرت ولید بن عقبہ، عبداللہ بن عامر اموی، یعلیٰ بن امیہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ ان سب سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عائشہ نے بصرہ کو اپنا مرکز بنانے کا پروگرام بنایا، کیونکہ وہاں سے حمایت ملنے کی امید تھی۔ ام المومنین حضرت حفصہ بھی حضرت عائشہ کے ساتھ جانا چاہتی تھیں، لیکن ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر نے منع کر دیا، وہ اہل مدینہ کی طرح مسلمانوں کی باہمی جنگ کو برا سمجھتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عہد عثمانی کے گورنر یعلیٰ بن امیہ نے چھ سو اونٹ، چھ لاکھ درہم دیے اور ابطح (محصب) کو لشکر کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ انھوں نے حضرت عائشہ کے لیے دو سو دینار میں عسکر نامی اونٹ خریدا۔ بصرہ کے گورنر عبداللہ بن عامر نے بھی زر کثیر فراہم کیا۔ مکہ میں منادی کرا دی گئی کہ ام المومنین، طلحہ اور زبیر بصرہ جا رہے ہیں۔ جو اسلام کی سربلندی چاہتا ہے، عثمان کا خون بہا لینا اور ان کے قتل کو جائز سمجھنے والوں سے جنگ کرنا چاہتا ہے، شامل ہو جائے، اگرچہ اس کے پاس سواری اور سامان سفر نہ ہو۔ اس طرح ایک ہزار (دوسری روایت: تین ہزار) کے لگ بھگ سپاہی فراہم ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ حضرت ام فضل نے حضرت علی کو خبر کر دی۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ نے حضرت عائشہ کو خط لکھا: اللہ نے تم پر پردہ واجب قرار دیا ہے۔ دین کے ستون عورتوں سے قائم نہیں رہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تمھیں اس اونٹ پر سوار دیکھ لیتے تو کیا کہتے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر (یا عبدالرحمٰن بن عتاب) کو نماز کا امام مقرر کیا گیا۔ لشکر روانہ ہوا تو امہات المومنین روتی روتی ذات عرق تک ساتھ گئیں۔ اس نسبت سے اس دن کو 'روز گریہ' کہا گیا۔

اہل بصرہ کا ردعمل

بصرہ کے میدانوں میں عمیر عبداللہ تمیمی حضرت عائشہ سے ملے اور کہا: ام المومنین، آپ ایسی قوم کی طرف جا رہی ہیں جس سے آپ کی کوئی خط و کتابت بھی نہیں ہوئی۔ تب انھوں نے بصرہ کے کچھ لوگوں اور احنف بن قیس کو خط لکھے۔ حضرت عائشہ نے اہل بصرہ سے بات چیت کے لیے ابن عامر کو بھیجا، کیونکہ بصرہ میں ان کی زمینیں اور مکانات تھے۔ جواب میں حضرت علی کے مقررہ گورنر بصرہ حضرت عثمان بن حنیف نے حضرت عمران بن حصین اور ابوالاسود دوئلی کو قاصد بنا کر بھیجا۔ حضرت عائشہ نے ان سے کہا: ہم اصلاح کی خاطر آئے ہیں، قاتلین عثمان کے خلاف ہماری مدد کریں۔ وہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر سے ملے تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ مثبت صورت حال کے باوجود ابوالاسود نے واپس جا کر حضرت عثمان بن حنیف کو جنگ کی تیاری کا مشورہ دے دیا، جب کہ حضرت عمران نے کہا: یہ جنگ سب کو ایک زبردست عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ ہشام بن عامر نے حضرت علی کے آنے تک جنگ سے گریز کا مشورہ دیا۔ حضرت عثمان نے ان کی رائے بھی رد کر دی اور جنگ کے لیے تیار ہونے کا اعلان کر دیا۔ قیس بن عقدیہ نے شہریوں کو جنگ پر ابھارا، جب کہ اسود بن سریع نے کہا: یہ لوگ ہمارے پاس گھبرائے ہوئے مدد کے طالب بن کر آئے ہیں۔ حضرت عثمان سمجھ گئے کہ اس کش مکش میں بصرہ کے شہری موافق و مخالف گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو حضرت عائشہ کی مدد کریں گے۔

بصرہ: میدان جنگ

۲۵؍ ربیع الثانی ۳۶ھ: اس اثنا میں حضرت عائشہ کی فوج نے آگے بڑھ کر بصرہ کے محلہ مربد میں ڈیرے ڈال دیے۔ حضرت عثمان بن حنیف بھی مقابلے کے لیے شہر سے نکل آئے۔ بصرہ میں موجود حضرت عائشہ کے مؤیدین ان کے ساتھ آ شامل ہوئے۔ میمنہ و میسرہ کے کمانڈروں حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے باری باری حضرت عثمان کے فضائل بیان کیے، ان پر ہونے والے ظلم کا ذکر کیا اور ان کا قصاص لینے کا عزم کیا تو مربد کے دائیں طرف کھڑی ان کی فوج نے تائید کے نعرے بلند کیے، جب کہ بائیں طرف ایستادہ جیش عثمان بن حنیف

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں شور مچ گیا اور انھیں حضرت علی کی بیعت توڑنے کے طعنے دیے گئے۔ حضرت عائشہ نے حمد وثنا کے بعد حضرت عثمان بن عفان کی بے گناہی اور ان کا ناحق خون بہانے کا بیان کیا تو خود حضرت عثمان بن حنیف کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ کچھ نے کہا: اماں عائشہ نے سچ کہا اور کچھ نے مخالفانہ نعرے لگائے۔ دھینگا مشتی کے بعد حضرت عثمان بن حنیف کی فوج کا ایک حصہ حضرت عائشہ سے آملا۔ کعب بن سور ازدی نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ جاریہ بن قدامہ بولے: حضرت عثمان کی شہادت سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ آپ اس لعنتی اونٹ پر سوار ہو کر گھر سے باہر نکل آئی ہیں۔ بنو سعد کے ایک نوجوان نے حضرت طلحہ و حضرت زبیر کو طعنہ دیا کہ میں تم دونوں کی ماں کو تو ساتھ دیکھ رہا ہوں، کیا اپنی بیویوں کو بھی نکال لائے ہو؟

جنگ کی ابتدا ہوئی تو سیدہ عائشہ نے حکم جاری کیا کہ صرف ایسے شخص سے جنگ کی جائے جو ابتدا کرے اور جس کا عثمان کی شہادت سے تعلق ہو۔ حکیم بن جبلہ نے آغاز کیا، حضرت عائشہ نے مدافعت کا حکم دیا۔ حضرت عثمان کے ساتھیوں نے پتھر پھینکنے شروع کیے تو حضرت عائشہ کی فوج داہنی طرف مقبرۂ بنومازن تک سمٹ آئی۔ اس اثنا میں رات ہو گئی اور حضرت عثمان بن حنیف محل میں چلے گئے۔ رات کے وقت بصرہ کے شخص ابوالجربا نے مخبری کی اور وہ جیش عائشہ کو مقبرۂ بنومازن سے مقبرۂ بنو حصن تک لے آیا۔ یہ دار الرزق (بیت المال) کا صحن تھا۔ اگلے روز بیت المال کے سامنے گھمسان کی لڑائی ہوئی جو زوال تک شدت سے جاری رہی۔ حضرت عثمان کی فوج کو بہت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ فریقین نے اس شرط پر صلح کی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے کن حالات میں حضرت علی کی بیعت کی۔ قصر، جامع مسجد اور دارالرزق حضرت عثمان بن حنیف کے ہاتھ میں رہنے دیے گئے، جب کہ نماز کی امامت کے لیے حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی باریاں مقرر کی گئیں۔ کعب بن سور کو مدینہ بھیجا گیا۔ حضرت اسامہ بن زید اور حضرت محمد بن مسلمہ نے بتایا کہ ان اصحاب سے جبراً بیعت لی گئی (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۲۸)۔ حضرت علی نے گورنر عثمان کو خط لکھا کہ واللہ، ان دونوں کو جماعت اور اس کی فضیلت میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا، اگر وہ قلادۂ اطاعت اتارنا چاہتے ہیں تو کوئی مجبوری نہیں۔ حسب پیمان حضرت عثمان کو بصرہ کی گورنری چھوڑنی تھی، انھوں نے عہد شکنی کی تو پھر جنگ چھڑ گئی۔ عشا کے وقت مسجد کے اندر قتال کرنے کے بعد حضرت عثمان بن حنیف کو پکڑ لیا گیا اور بیت المال پر قبضہ کر لیا گیا۔ چالیس کوڑے مارنے کے بعد حضرت عثمان کی ڈاڑھی اور بھنووں کے بال اکھاڑے گئے اور پھر حضرت عائشہ کے کہنے پر چھوڑ دیا گیا۔

حکیم بن جبلہ کی صلح شکنی

اب حضرت عثمان بن عفان کے قاتل حکیم بن جبلہ نے حضرت عثمان بن حنیف کے ساتھ ہونے والے سلوک کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔اس نے عبدالقیس اور ربیعہ کے حلیف قبائل کو اکٹھا کیا اور اپنی چار کمانڈروں والی فوج کے ساتھ جیش طلحہ وزبیر سے سخت جنگ کی۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بصرہ کے تمام قاتلین عثمان کو ہمارے سامنے جمع کر دیا ہے۔ دوران جنگ میں حکیم کا پاؤں کٹا، پھر وہ تیر سے زخمی ہو کر اپنے انجام کو پہنچا۔اسے یزید بن اسحم نے قتل کیا۔اس کا بیٹا اشرف اور بھائی رعل بن جبلہ بھی مارے گئے۔ذریح اور اس کے ساتھی اپنے انجام کو پہنچے، البتہ حرقوص بن زہیر بھاگ نکلا۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے منادی کرائی کہ جس جس بلوائی نے مدینے پر حملہ کیا، پکڑ کر لایا جائے۔ سب کو قتل کر دیا گیا، اس طرح حرقوص کے علاوہ بصرہ میں موجود تمام قاتلین عثمان اپنے انجام کو پہنچے۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر کی مخالفت ختم ہو گئی اور اہل بصرہ نے ان کی بیعت کر لی۔ جنگ سے فراغت کے بعد سیدہ عائشہ نے اہالیان کوفہ، یمامہ و مدینہ کو خط بھیجے کہ علی کا ساتھ چھوڑ دیں اور قاتلین عثمان کو سزا دینے کا مطالبہ کریں۔ زید بن صوحان نے جواب دیا: ام المومنین گھر میں بیٹھیں تو ہم ان کی نصرت کرنے کو تیار ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت علی کا سفر بصرہ

ربیع الثانی ۳۶ھ کے اواخر میں حضرت علی حضرت تمام بن عباس کو مدینہ کا قائم مقام حاکم مقرر کر کے محض سات سو ساٹھ سواروں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ان کا ارادہ تھا کہ بصرہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی حضرت طلحہ و حضرت زبیر کی فوج کو جا لیں۔ حضرت عقبہ بن عامر نے انصار کی طرف سے گزارش کی کہ مدینہ چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ حضرت علی نے کہا: عراق مسلمانوں کی بہت بڑی نو آبادی ہے۔ وہاں کے بیت المال مال وزر سے پر ہیں، اس لیے میرا وہاں موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے حضرت علی کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر التجا کی: امیر المومنین، مدینہ سے نہ نکلیں۔آپ یہاں سے چلے گئے تو مسلمانوں کا کوئی خلیفہ مدینہ میں قیام نہ کر سکے گا۔ سبائی (سبیئی) ان کو گالیاں نکالنے لگے تو حضرت علی نے منع کیا اور کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین صحابہ میں سے ہیں۔ ذی قار کے مقام پر دس ہزار سے زائد افراد ان کی فوج میں شامل ہوئے۔ کنانہ، اسد، تمیم، رباب، مزینہ، قیس، بکر، تغلب، مذحج، اشعر، بجیلہ، انمار، خثعم اور

ازد قبائل پر مشتمل لشکر ذی قار پہنچا تو حضرت علی اور حضرت ابن عباس نے اس کا استقبال کیا۔ حضرت علی نے کہا: تم لوگوں نے عجمی بادشاہوں سے جنگ کر کے ان کی جمعیت کو منتشر کر دیا ہے۔ میں نے تمھیں بصرہ والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بلایا ہے۔ اگر وہ سرکشی سے باز نہ آئے تو ہم نرمی سے ان کا علاج کریں گے اور فساد کے بجاے اصلاح کا طریقہ اپنائیں گے۔

ربذہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر کا لشکر آگے بڑھ کر بصرہ میں داخل ہو چکا ہے۔ حضرت علی خوش ہوئے کہ قریبی شہر کوفہ میں عرب آباد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: یہی لوگ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتے اور فتنہ انگیزی کرتے ہیں۔ حضرت علی نے جواب دیا: اگر وہ سیدھے رہیں گے تو ہم ان کے ساتھ احسان سے پیش آئیں گے۔ حضرت علی ربذہ میں ٹھیر کر آیندہ کا لائحۂ عمل سوچنے لگے۔ اسی اثنا میں ان کے بیٹے حضرت حسن آئے اور ان سے جدال کرنے لگے۔ آپ نے میری بات نہیں مانی، کل کلاں کو ناحق مارے گئے تو کوئی آپ کی مدد بھی نہ کرے گا۔ حضرت علی نے کہا: تم کیا لڑکیوں کی طرح غنغناتے رہتے ہو؟ حضرت حسن نے کہا: خلیفۂ سوم کا محاصرہ کیا گیا تو میں نے کہا کہ آپ شہر سے چلے جائیں۔ ان کی شہادت کے بعد میں نے مشورہ دیا کہ جب تک عرب کے تمام شہروں سے وفود نہ پہنچ جائیں، کسی سے بیعت نہ لیں۔ اس بار بھی میں نے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے نہ نکلیں تاکہ جو فساد رونما ہو، اس کی ذمہ داری طلحہ و زبیر پر عائد ہو۔ حضرت علی نے ان اعتراضات کے باری باری جواب دیے۔ محاصرہ صرف عثمان کا نہیں، بلکہ ہم سب کا ہوا تھا۔ اگر ہم مدینہ چھوڑ کر جانا چاہتے تو ہمیں بھی اسی طرح گھیر لیا جاتا، جیسے عثمان کو گھیر لیا گیا تھا۔ انتخاب خلیفہ کا کام ہی اہل مدینہ کا تھا۔ دوسروں کی بیعت انھی کے تابع ہے۔ پہلے تین خلفا کا انتخاب ہوا تو میں نے ان کا ساتھ دیا، حالاں کہ میں اپنے آپ کو خلافت کا حق دار سمجھتا تھا۔ اہل ایمان نے اب خوش دلی سے میری بیعت کی ہے۔ میں ان کے ساتھ مل کر مخالفین سے لڑوں گا، حتیٰ کہ اللہ ہمارے بیچ فیصلہ کر دے۔ یہ ذمہ داری مجھے ہی ادا کرنا ہو گی۔ میں گوہ کی طرح کیسے چھپ کر گھر میں بیٹھ سکتا ہوں، جب کہ عرب کے بہترین جوان طلحہ اور بہترین جنگجو زبیر میرے درپے ہیں اور اہل ایمان کی مطاع ام المومنین ان کا ساتھ دے رہی ہیں؟ (مستدرک حاکم، رقم ۴۵۹۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۵۲۶)۔

ربذہ کے مقام پر حضرت عثمان بن حنیف حضرت علی سے ملے اور کہا: امیر المومنین، آپ نے مجھے بھیجا تھا تو میرے ڈاڑھی تھی اور اب میں آپ کے پاس بے ریش لوٹا ہوں۔ فرمایا: تو نے اجر حاصل کیا اور بھلائی پالی۔ پھر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہا: طلحہ و زبیر نے میری بیعت کی، پھر توڑ ڈالی۔ حیرت ہے کہ وہ ابو بکر، عمر اور عثمان کے مطیع رہے اور علی کے مخالف ہو گئے۔ اے اللہ، ان کی گرہیں کھول دے اور ان کا عمل ان کی نگاہوں میں برا ثابت کر دے۔ انھوں نے محمد بن ابو بکر اور حضرت محمد بن جعفر کو خط دے کر کوفہ روانہ کیا اور وہاں کے شہریوں سے نصرت و حمایت کی درخواست کی، مدینہ سے مزید اسلحہ اور سواریاں بھی منگوائیں۔ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: یہ امت پہلی امتوں کی طرح فرقوں میں بٹ کر رہے گی، آنے والے اس شر سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اپنے دین سے چپکے رہو، قرآن جس عمل کی تصدیق کرے، اس پر پختہ ہو جاؤ اور جس کام پر نکیر کرے، اسے ترک کر دو، میری ہدایت پر عمل کرو، کیونکہ یہ تمھارے نبی کی ہدایت ہے۔ رفاعہ بن رافع کا بیٹا اٹھ کر بولا: امیر المومنین، آپ ہمیں کہاں اور کس لیے لے جا رہے ہیں؟ کہا: ہم اصلاح چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے مقابل نہ مانے؟ ابن رفاعہ نے پھر سوال کیا۔ ہم انھیں چھوڑ دیں گے جب تک وہ ہمیں کچھ نہیں کہتے۔ اور اگر انھوں نے ہم سے تعرض کیا؟ تو ہم دفاع کریں گے۔ اس نے کہا: خوب۔ حجاج بن غزیہ انصاری نے کہا: ہم اپنے عمل سے آپ کو خوش کر دیں گے۔

حضرت عدی بن حاتم طائی نے اپنی قوم کو حضرت علی کی اعانت کی ترغیب دی۔ چنانچہ ربذہ میں بنو طے کے تیرہ ہزار افراد حضرت علی کی فوج میں شامل ہوئے۔ کچھ طائی سلام کر کے واپس ہونے لگے تو حضرت علی نے کہا: ''اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں کے مقابلے میں بڑے اجر کی فضیلت سے نوازا ہے'' (النساء ۴: ۹۵)۔ سعید بن عبید طائی نے کہا: میری زبان میرے دلی جذبات کو بیان نہیں کر پا رہی۔ میں ظاہراً اور دل سے آپ سے خیر خواہی کروں گا۔ ہر معرکے میں آپ کے دشمنوں سے قتال کروں گا۔ حضرت علی نے کہا: اللہ تم پر رحم کرے، تمھاری زبان نے تمھارا مافی الضمیر خوب بیان کر دیا ہے۔ بنو طے کے ہم سایہ قبیلے بنو اسد کی ایک جماعت بھی حضرت علی کے لشکر میں آملی۔

اس اثنا میں حضرت عمار بن یاسر نے حضرت طلحہ و حضرت زبیر کے خلاف عوامی مہم چلائی اور کوفہ کی آبادی کو حضرت علی کی حمایت پر جمع کر دیا۔ ربذہ میں کچھ دیر ٹھیر کر حضرت علی نے محمد بن ابو بکر اور حضرت محمد بن جعفر کے لوٹنے کا انتظار کیا۔ انھیں خبر ملی کہ عبد القیس اور ربیعہ کے حلیف قبائل حضرت طلحہ و حضرت زبیر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو کہا: عبد القیس ربیعہ قبیلے کی بہترین شاخ ہے اور ربیعہ کے ہر قبیلے میں خیر پائی جاتی ہے۔ فید کے مقام پر بنو اسد اور بنو طے کے مزید لوگ آئے تو حضرت علی نے کہا: میرے ساتھ کافی لوگ ہیں۔ راستے میں قبیلۂ عبد القیس اور بکر بن وائل کے دستے ضم ہوئے تو حضرت علی کی فوج کی نفری بیس ہزار ہو گئی۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں: جنگ جمل میں حضرت علی کی طرف سے آٹھ سو انصاری اور بیعت رضوان میں شریک

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چار سو صحابہ نے حصہ لیا۔ سدی کا کہنا ہے: جیش علی میں شامل بدری اصحاب کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ ذہبی نے شعبی کی بتائی ہوئی تعداد صحابہ (چار یا چھ) کو مبالغہ قرار دیا ہے۔ جیش عائشہ کا عدد تیس ہزار کو پہنچ چکا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کی معزولی

دونوں محمد واپس لوٹے اور بتایا کہ گورنر ابو موسیٰ اشعری کا کہنا ہے: قاتلین عثمان کو ان کے انجام تک پہنچائے بغیر ہم کسی قتال میں حصہ نہ لیں گے۔ ہم نے عثمان کی حفاظت میں کوتاہی کی، اس لیے معاملات یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب حضرت علی نے اشتر سے کہا: تم اور عبد اللہ بن عباس جاؤ اور بگاڑ سلجھانے کی کوشش کرو۔ دونوں نے کوفہ جا کر کچھ لوگوں کو ساتھ لیا اور حضرت ابو موسیٰ سے ملاقات کی۔ حضرت ابو موسیٰ نے حضرت علی کے انتخاب کو جائز تسلیم کیا، تاہم اہل کوفہ کو اس خانہ جنگی میں غیر جانب دار رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے حضرت علی کے قاصدوں کو شہید مظلوم حضرت عثمان کی تائید کرنے کو کہا تاکہ یہ فتنہ فرو ہو۔ اشتر اور حضرت ابن عباس لوٹ آئے تو حضرت علی نے حضرت ہاشم بن عتبہ کے ہاتھ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو خط لکھا: تم پر لازم ہے کہ حق میں میری اعانت کرو۔ ان کی طرف سے جنگ میں عدم تعاون کی اطلاع پا کر حضرت علی نے حضرت حسن اور حضرت عمار کو بھیجا تاکہ وہ اہل کوفہ کو ان کی حمایت پر آمادہ کریں۔ انھوں نے حضرت قرظہ بن کعب کو کوفہ کا نیا گورنر تعینات کر کے ساتھ بھیجا۔ حضرت عمار کو نصیحت کی کہ فساد ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ حضرت حسن اور حضرت عمار کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسروق بن اجدع ان سے ملے اور سوال کیا: تم لوگوں نے عثمان کو کیوں شہید کیا؟ انھوں نے ہماری عزتوں کو پامال کیا اور ہمارے جسموں کو مشق ستم بنایا تھا، حضرت عمار کا جواب تھا۔ مسروق نے کہا: اگر تم صبر کر لیتے تو بہتر ہوتا۔ پھر حضرت ابو موسیٰ آئے اور حضرت حسن کو گلے لگا لیا۔ حضرت حسن نے ان سے پوچھا: آپ لوگوں کو ہم سے کیوں دور کر رہے ہیں؟ واللہ، ہم تو محض اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اسی مجلس میں جب حضرت عمار اور حضرت حسن کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑے خطاب کر رہے تھے، ایک شخص نے سیدہ عائشہ کو گالی دے ڈالی۔ حضرت عمار نے اسے ڈانٹ کر بٹھا دیا اور کہا: خاموش ہو جا، او لا خیرے، پیچ انسان! عائشہ دنیا و آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے یہ معلوم کرنے کے لیے تم کو آزمایش میں ڈالا ہے کہ تم اس کی اطاعت کرتے ہو یا عائشہ کی؟ (بخاری، رقم ۳۷۷۲۔ ترمذی، رقم ۳۸۸۸-۳۸۸۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۳۸)۔ حضرت ابو موسیٰ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اصحاب رسول، اللہ اور رسول کے بارے میں بہتر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علم رکھتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''عنقریب ایک بڑا فتنہ رونما ہو گا جس میں سویا ہوا بیدار سے، بیدار بیٹھے ہوئے سے، بیٹھا ہوا کھڑے ہوئے سے، کھڑا ہوا چلنے والے سے، چلنے والا سوار سے اور سوار دوڑنے والے سے بہتر ہو گا''۔ حضرت عمار غصے میں آ کر گالیاں دینے لگے اور کہا: یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تم اکیلے ہی کو کی ہو گی۔ بنو تمیم کا ایک شخص اٹھ کر حضرت عمار پر سب و شتم کرنے لگا۔ حضرت ابو موسیٰ پھر کھڑے ہوئے اور بولے: اللہ نے ہمیں بھائی بھائی بنایا ہے اور ہمارے جان و مال کو ایک دوسرے پر حرام قرار دیا ہے۔ تم بھی تلواروں کو میان میں کر لو، نیزوں کے پھل الگ کر لو، کمانوں کو توڑ ڈالو اور مظلوم کو پناہ دو، حتیٰ کہ معاملہ سدھر جائے اور یہ فتنہ زائل ہو جائے۔ زید بن صوحان نے کہا: ابو موسیٰ، امیر المومنین علی کی فوج میں شامل ہو جاؤ۔ حضرت قعقاع بن عمرو کھڑے ہوئے: امیر المومنین اصلاح کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضرت عمار اور حضرت ابو موسیٰ میں بہت جھگڑا ہوا، اسی شور و غوغا میں مجمع منتشر ہو گیا۔

آخر کار اشتر نے گورنر حضرت ابو موسیٰ کے بچوں کو مارا پیٹا اور محل سے باہر نکال دیا۔ اس نے حضرت ابو موسیٰ کو رات ہونے سے پہلے پہلے محل خالی کرنے کو کہا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت قرظہ کی آمد پر وہ فوراً حکومت سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد کوفہ سے بارہ ہزار کا لشکر حضرت علی کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔

جنگ سے پہلے مصالحت کی کوشش

قبیلۂ عبدالقیس کے ہزاروں افراد بصرہ کے راستے میں حضرت علی کی آمد کے منتظر تھے۔ ذی قار سے حضرت علی نے حضرت قعقاع کو بصرہ بھیجا تاکہ وہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر سے ملیں اور جماعت و الفت کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ حضرت قعقاع پہلے حضرت عائشہ سے ملے اور پوچھا: اماں جان، آپ اس شہر میں کیونکر آئی ہیں؟ لوگوں میں صلح و صفائی کرانے کے لیے، انھوں نے جواب دیا۔ حضرت قعقاع نے کہا: طلحہ و زبیر کو پیغام بھیجیں کہ وہ بھی میری بات سن لیں۔ حضرت قعقاع ان دونوں سے ملے تو پوچھا: کیا آپ کا مقصد بھی وہی ہے جو ام المومنین کا ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو پوچھا: یہ اصلاح کس طرح ہو گی؟ انھوں نے جواب دیا: قاتلین عثمان کو چھوڑ دینا ترک قرآن ہو گا۔ حضرت قعقاع نے کہا: تم نے بصرہ سے تعلق رکھنے والے قاتلوں کو تو مار دیا، لیکن ان سے پہلے چھ سو افراد کو قتل کرنا پڑا۔ اب تم حرقوص بن زہیر کے درپے ہو اور چھ ہزار کی فوج اس کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہے۔ جیسے تمھارے لیے حرقوص سے قصاص لینا ممکن نہیں رہا، اسی طرح علی معذور ہیں۔ انھوں نے قصاص کو اس وقت تک موخر کر رکھا ہے جب تک ان مفسدین پر قابو نہیں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پالیتے۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمھارا کیا مشورہ ہے؟ حضرت قعقاع نے کہا: اس وقت تمام شہروں میں کشید گی پائی جاتی ہے۔ ربیعہ و مضر کے بہت سے قبائل آمادہ بہ جنگ ہیں۔ ہمیں جنگ بندی کر کے حالات کو پر سکون بنانا ہو گا۔ آپ قصاص موخر کر کے حضرت علی کی بیعت کر لیں تو خیر و رحمت کا ظہور ہو گا۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے اس بات سے اتفاق کر لیا۔ حضرت قعقاع نے واپس جا کر حضرت علی کو خبر دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

قاتلین عثمان کی شر انگیزی

بصرہ روانگی سے پہلے حضرت علی نے خطبہ دیا: اسلام نے دور جاہلیت کی بد بختی ختم کر کے ہم میں الفت و محبت پیدا کی۔ ابو بکر و عمر کے عہد میں لوگ متحد تھے۔ پھر کچھ لوگوں کے حرص و حسد کی وجہ سے عثمان کی شہادت کا سانحہ رونما ہوا۔ کل ہم کوچ کریں گے، ہمارے ساتھ ایسا کوئی شخص ہر گز نہ چلے جس نے عثمان کے خلاف بغاوت میں کسی طور بھی مدد کی ہو۔ یہ سن کر قاتلین عثمان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چنانچہ علبا بن ہیثم، عدی بن حاتم، سالم بن ثعلبہ، شریح بن اوفی، اشتر، ابن سودا اور خالد بن ملجم نے میٹنگ کی۔ اشتر نے کہا: اس سے پیشتر کہ علی ہماری جانیں لینے کے مطالبہ پر مخالفین سے متفق ہو جائیں، ہم انھیں بھی عثمان کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ عبد اللہ بن سودا نے تسلی دی کہ ہماری تعداد کم نہیں، لیکن عزت اسی میں ہے کہ لوگوں میں مل جل کر رہیں۔ اگر ہم عام مسلمانوں سے الگ تھلگ ہو گئے تو وہ ہمیں روند ڈالیں گے۔ آخر کار انھوں نے جیش علی میں شامل رہنے پر اتفاق کیا اور فیصلہ کیا کہ فریقین کو ہر گز اکٹھا نہ ہونے دیا جائے اور موقع ملتے ہی ان میں جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے۔ لشکر ربذہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہوا، حضرت علی سرخ اونٹنی پر سوار، سرخ و سیاہ گھوڑے کو ساتھ لیے ہوئے تھے۔ ابو لیلیٰ بن عمر مقدمہ پر مامور تھے، محمد بن حنفیہ نے علم اٹھا رکھا تھا۔ بصرہ پہنچ کر حضرت علی نے زاویہ میں قیام کیا، وہاں سے چل کر قصر عبد اللہ بن زیاد پہنچے۔ حضرت عائشہ بھی فرضہ سے اپنا لشکر لے کر یہاں آ گئیں۔ دونوں لشکر تین روز تک آمنے سامنے ٹھیرے رہے، لڑائی نہ ہوئی، تاہم پیام رسانی کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران میں احنف بن قیس نے جلحا کے مقام پر اپنے چھ ہزار ساتھیوں سمیت حضرت علی کی جنگ سے الگ ہونے کا اعلان کیا۔ وہ حضرت علی کی بیعت کر چکے تھے، لیکن ام المومنین سیدہ عائشہ اور حواری رسول اللہ حضرت زبیر کے خلاف لڑنا نہ چاہتے تھے۔ بنو سعد نے ان کا ساتھ دیا۔ کعب بن سور نے مرتے دم تک حضرت عائشہ کا ساتھ دیا، اس لیے یہ بات درست نہیں لگتی کہ انھوں نے بنو ازد کے سردار صبرہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بن شیمان کو ان کی حمایت کرنے سے روکا۔

جنگ جمل: ابتدا کیسے ہوئی؟

جمادی الاولیٰ ۳۶ھ (۷/ نومبر ۶۵۶ء، دوسری روایت: ۱۵/ جمادی الثانی ۳۶ھ، ۹/ دسمبر ۶۵۶ء) میں بصرہ کے قصر عبیداللہ بن زیاد کے پاس جنگ جمل ہوئی، جس میں دس ہزار سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ اس جنگ میں حضرت علی، حضرت عمار، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت سہل بن حنیف اور کئی صحابہ نے حصہ لیا۔ اہل بصرہ تین گروہوں میں بٹ چکے تھے، ایک گروہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر کا ساتھ دے رہا تھا، ایک حضرت علی کا اور تیسرا جس میں احنف بن قیس اور حضرت عمران بن حصین تھے، جنگ نہ کرنا چاہتا تھا۔ حضرت علی نے حکیم بن سلامہ اور مالک بن حبیب کو یہ پیغام دے کر حضرت طلحہ و حضرت زبیر کے پاس بھیجا، اگر تم قعقاع کے ساتھ کی جانے والی بات پر قائم ہو تو جنگ سے رکے رہو۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فوج میں شامل مضر، ربیعہ اور یمنی قبائل کو پورا یقین تھا کہ صلح ہو جائے گی۔ اسی شام انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس کو حضرت طلحہ و حضرت زبیر کی طرف بھیجا اور ان کی طرف سے محمد بن ابو طلحہ حضرت علی سے ملنے آئے۔ فریقین نے خوشی اور اطمینان سے رات بسر کی، دوسری طرف خلیفۂ مظلوم کے قاتلوں میں بے حد اضطراب رہا۔ پو پھٹنے سے پہلے ان کے دو ہزار کے قریب آدمیوں نے تلواریں سونتیں اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے اسے اہل کوفہ کا حملہ سمجھا۔ چنانچہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے کہا: ہمیں علم تھا کہ علی خون ریزی کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادھر حضرت علی نے شور و غوغا سنا تو پوچھا: کیا ہوا؟ انھیں بتایا گیا کہ رات کو حملہ ہوا جس کا ہم نے بھرپور جواب دیا ہے۔ کہا: میں جانتا تھا کہ طلحہ و زبیر خون بہانے سے باز نہ آئیں گے۔ ابن سبا کے ساتھی خوب قتل و غارت کر رہے تھے، حضرت علی پکار رہے تھے: رکو! رکو! لیکن کوئی ان کی سن نہ رہا تھا۔ کعب بن سور حضرت عائشہ کے پاس آئے اور جنگ رکوانے کی استدعا کی۔ وہ کجاوے پر سوار ہو کر نکلیں، لیکن تب تک جنگ کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ حضرت علی نے لوگوں کے سر اڑتے دیکھے تو حضرت حسن کو ساتھ چمٹا لیا۔

حضرت زبیر کا میدان جنگ چھوڑ جانا

جنگ میں شریک حضرت عمار بن یاسر حضرت زبیر بن عوام پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنگ انھی کی وجہ سے شروع ہوئی ہے، لیکن حضرت زبیر اپنے آپ کو بچاتے رہے اور کوئی جوابی حملہ نہ کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان تھا: ''عمار، تمھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا'' (بخاری، رقم ۴۴۷)۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس معرکہ میں عمار شہید ہو گئے تو ہماری فوج ہی باغی قرار پائے گی۔ حضرت عمار انھیں نیزہ مارنے لگے تھے کہ حضرت زبیر نے روک کر پوچھا: ابوالیقظان، کیا آپ مجھے مار ہی ڈالیں گے؟ نہیں، اے ابوعبداللہ تم نکل جاؤ، میں بھی ہٹ جاتا ہوں، انھوں نے کہا۔ آخر کار حضرت زبیر نے جنگ سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی اثنا میں حضرت علی خچر پر سوار ہو کر آئے اور پکارے: زبیر کو بلاؤ۔ وہ آئے تو پوچھا: تجھے کس نے کشت و خون پر آمادہ کر دیا؟ تو نے، تو ہم سے زیادہ خلافت کا حق دار نہیں، حضرت زبیر نے جواب دیا۔ حضرت علی نے کہا: کیا عثمان کے بعد بھی میں خلافت کا اہل نہیں ہوا؟ تمھیں وہ دن یاد ہے جب انصار کے سقیفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا، زبیر، تم علی سے محبت کرتے ہو؟ تم نے کہا: ہاں، بھلا میں اپنے ماموں زاد، چچا زاد اور ہم مذہب سے محبت نہ کروں گا۔ پھر آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا تو میں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔ بنو غنم سے گزرتے ہوئے تم نے کہا تھا: ابو طالب کا بیٹا اپنی اکڑ کو نہیں چھوڑے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا تھا: علی میں اکڑ نہیں، لیکن زبیر، تم علی سے قتال کرو گے، حالاں کہ تم ظالم ہو گے۔ حضرت زبیر نے تصدیق کی اور کہا: میں یہ بات بھول چکا تھا، اگر یاد ہوتا تو اس راہ پر ہرگز نہ چلتا (مستدرک حاکم، رقم ۵۵۷۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۸۲)۔ وہ فوراً حضرت عائشہ کے پاس گئے اور جانے کی اجازت چاہی، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے انھیں بزدلی اور موت سے ڈرنے کا طعنہ دیا تو انھوں نے کہا: میں نے قتال نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ بیٹے نے قسم کا کفارہ دینے کے لیے اپنا غلام مکحول (یا سرجس) دیا، لیکن وہ اپنے گھوڑے (ذوالخمار) پر سوار پلٹے اور فوج کی صفیں چیرتے ہوئے میدان جنگ چھوڑ گئے (مستدرک حاکم، رقم ۵۵۷۵)۔ حضرت زبیر کے جنگ سے رجوع کرنے کی خبر حضرت علی تک پہنچی تو کہا: ابن صفیہ (زبیر) کو اگر اپنا حق پر ہونا یقینی ہوتا تو ہرگز رجوع نہ کرتے (کنزالعمال، رقم ۳۱۶۴۸)۔

حضرت زبیر کی شہادت

۱۰/ جمادی اولیٰ ۳۶ھ (۶۵۶ء): حضرت زبیر میدان کارزار سے نکلے تو احنف نے کہا: فوجوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے یہ جا رہے ہیں، کون ان کی اطلاع لائے گا؟ عمرو بن جرموز تمیمی، فضالہ بن حابس اور نفیع (یا نفیل بن حابس) نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ بصرہ سے پانچ میل دور وادی سباع کے مقام پر ابن جرموز نے حضرت زبیر کو جا لیا۔ انھوں نے نماز شروع کی ہی تھی کہ ابن جرموز نے ان کی زرہ کے گریبان والے حصے میں نیزہ مارا

اور شہید کر ڈالا، ان کے غلام عطیہ کو چھوڑ دیا، گھوڑے، اسلحہ اور انگوٹھی پر قبضہ کیا اور بصرہ واپس جا پہنچا۔ احنف نے کہا: میں نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اچھا کیا کہ برا۔ عمرو حضرت زبیر کا سر اور ان کی تلوار لے کر حضرت علی کے پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے شاباشی ملے گی، لیکن حضرت علی نے اسے جہنم کی وعید سنائی (کنزالعمال، رقم ۳۱۶۵۲)۔ حضرت زبیر کی تلوار پہچان کر حضرت علی نے فرمایا: زبیر نے کتنا ہی عرصہ اس تلوار کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ مبارک سے پریشانیاں زائل کیں (کنزالعمال، رقم ۳۱۶۵۰)۔

حضرت طلحہ کو کس نے شہید کیا؟

دوران جنگ میں حضرت علی اور حضرت طلحہ آمنے سامنے آئے تو حضرت علی نے پوچھا: تم دونوں نے اسلحہ اور فوج تو خوب تیار کر لی، کیا اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے عذر بھی سوچ رکھا ہے؟ 'وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا'، ''اس عورت کے مانند نہ ہو جانا جس نے خوب محنت کے بعد اپنا کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا'' (النحل ۱۶: ۹۲)۔ کیا میں تمھارا دینی بھائی نہیں اور تم نے میری بیعت نہیں کر رکھی؟ پھر میرے خون کو حلال سمجھنے لگے ہو؟ حضرت طلحہ نے الزام لگایا کہ آپ نے عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا تھا۔ جواب میں حضرت علی نے یہ آیت تلاوت کی: 'يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ'، ''اس دن اللہ ان کو پورا بدلہ دے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے'' (النور ۲۴: ۲۵) اور قاتلین عثمان پر لعنت بھیجی۔ انھوں نے کہا: تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ کو لڑنے کے لیے لے آئے ہو اور اپنی اہلیہ کو گھر میں چھپا رکھا ہے؟ حضرت طلحہ بولے: ہم نے عثمان کی جان بچانے میں کوتاہی کی، اس لیے ان کا قصاص لینے کے لیے اپنا خون بہانا ہی ہمارا مقصد بن گیا ہے۔ حضرت طلحہ حضرت عائشہ کے ساتھ کھڑے تھے (یا حضرت زبیر کی طرح میدان جنگ چھوڑ کر جا رہے تھے) کہ ایک اندھا تیر ان کی پنڈلی پر آ لگا اور اس میں سے پار ہو کر گھوڑے کے پہلو میں گھس گیا۔ ان کا موزہ خون سے بھر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مروان نے پھینکا تھا۔ حضرت قعقاع نے کہا: آپ زخمی ہیں، اپنی جنگ جاری نہیں رکھ سکتے۔ انھیں بصرہ کے ایک گھر میں لے جایا گیا جہاں ان کے سانس پورے ہوئے۔ حضرت طلحہ کے بیٹے عمران کا حضرت علی سے جو مکالمہ ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل حضرت عائشہ نہیں، بلکہ حضرت علی کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اگرچہ اس میں حضرت علی کا کوئی دخل نہ تھا (طبقات ابن سعد ۳/ ۱۶۰)۔ ابن کثیر کہتے ہیں: مروان کے علاوہ کسی شخص کا قاتل ہونا اقرب الی الصواب ہے (البدایہ ۷/ ۲۴۷)۔ ایک ضعیف روایت کے مطابق دم آخریں حضرت علی کا ایک ساتھی حضرت طلحہ کے پاس سے گزرا تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بیعت کر لی (کنزالعمال، رقم ۳۱۶۴۳)۔

عسکر پر وار، جنگ کا اختتام

دوپہر کے بعد جنگ سیدہ عائشہ کی کمان میں لڑی گئی اور عصر تک جاری رہی۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کو مضری قبائل نے گھیرے میں لے لیا تو انھوں نے کعب بن سور کو مصحف دے کر کہا: اونٹ سے آگے چل کر لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بلاؤ۔ وہ آگے بڑھے تو کوفی فوج کے مقدمۃ الجیش نے ان کا سامنا کیا۔ اس میں موجود عبداللہ بن سبا اور اس کے متبعین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں صلح نہ ہو جائے۔ انھوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے کعب کو شہید کر ڈالا۔ کئی تیر حضرت عائشہ کے ہودے میں لگے۔ وہ اللہ، اللہ پکار کر بولیں: میرے بیٹو، یوم حساب کو یاد رکھو۔ پھر حضرت عثمان کے قاتلوں پر لعنت بھیجنے اور انھیں بد دعا دینے لگیں۔ لوگ بھی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے۔ حضرت علی نے پوچھا: یہ شور و غل کیسا ہے؟ لوگوں نے بتایا: عائشہ قاتلین عثمان پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ حضرت علی بھی لعنت بھیجنے میں ان کے ہم آواز ہو گئے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۶۵)۔ حضرت علی کے میمنہ نے حضرت عائشہ کے میسرہ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، جب کہ حضرت عائشہ کا میمنہ حضرت علی کے میسرہ پر غالب رہا۔ اسی اثنا میں حضرت عائشہ نے مضری دستے کو زوردار حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جواب میں حضرت علی نے اپنے بیٹے محمد سے کہا کہ پرچم لے کر آگے بڑھ۔ اس نے ہمت نہ کی تو انھوں نے خود پرچم لے کر پیش قدمی کی اور خوب نیزہ چلایا، واپس آ کر پانی طلب کیا تو انھیں شہد دیا گیا۔ جنگ شدت پکڑ گئی، حضرت علی کے جرنیل زید بن صوحان شہید ہوئے۔ حضرت عائشہ کی فوج غالب ہونے لگی تو حضرت علی نے ربیعہ اور یمن کے دستوں کو بلایا۔ ان کے آنے پر جنگ میں پھر تیزی آئی، دونوں اطراف کے فوجی گتھم گتھا ہو گئے، فوجوں کے میمنہ و میسرہ قلب سے جا ملے۔ حضرت عائشہ کے کمانڈر عبدالرحمٰن بن عتاب قتل ہوئے تو وہ بنو ازد کے رسالے کو مخاطب کر کے پکاریں: آج وہ دلیری دکھاؤ جس کی ہم مثالیں سنا کرتے تھے، بنو ناجیہ کو آواز دی: اپنی ابطحی تلواروں کی کاٹ دکھا دو، پھر بنو ضبہ اور بنو عدی کو دلیری دلائی۔

بصرہ کے سابق قاضی عمیرہ (یا ان کے بھائی عمرو) بن یثربی سیدہ عائشہ کے اونٹ کے سر پر کھڑے اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ حضرت علی بولے: اونٹ پر حملہ کون کرے گا؟ ہند بن عمرو جملی نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ عمیرہ نے انھیں روکا اور دو واروں میں قتل کر دیا۔ پھر علبا بن ہیثم بڑھے اور عمیرہ کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ عمیرہ نے سیحان بن صوحان کو بھی موت سے ہم کنار کیا، پھر صعصعہ کو شدید زخمی کیا اور وہ بھی چل بسے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت عمار پکارے: تو نے ایک مضبوط قلعے (سیدہ عائشہ) کی پناہ لے رکھی ہے، تمھارے تک پہنچنے کی راہ نہیں۔ تو اپنے دعوے میں اگر سچا ہے تو اس لشکر سے نکل کر میری طرف آ۔ عمیرہ نے اونٹ کی مہار بنو عدی کے ایک شخص کو پکڑائی اور فوجوں کے مابین کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمار سامنے آئے تو عمیرہ نے وار کیا جو حضرت عمار نے چمڑے کی ڈھال سے بچایا، پھر انھوں نے تاک کر عمیرہ کے پاؤں کا نشانہ لیا۔ پاؤں کٹ جانے سے وہ پیٹھ کے بل آن گرے۔ انھیں قید کر کے حضرت علی کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے رحم کی اپیل کی، لیکن حضرت علی نے یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ کیا تین آدمیوں کی جان لینے کے بعد بھی معافی کی گنجایش ہے؟ حضرت علی نے اپنے سپاہیوں کو پھر حکم دیا: سیدہ عائشہ کے اونٹ 'عسکر' کو نشانہ بناؤ، کیونکہ اس کے گرے بغیر جنگ ختم نہ ہو گی۔ اب بنو عدی کا عمرو بن بجیرہ عسکر کی مہار پکڑے ہوئے تھا۔ ربیعہ عقیلی نے اسے للکارا، لڑتے لڑتے دونوں شدید زخمی اور جاں بحق ہوئے۔ حارث ضبی نے نکیل تھامی اور یہ مشہور رجز پڑھی:

نحن بنو ضبة أصحاب الجمل
نبارز القرن إذا القرن نزل

"ہم قبیلۂ بنوضبہ کے لوگ جمل والے ہیں، ہم سر کو مقابلے کے لیے للکارتے ہیں جب وہ سامنے اترتا ہے۔"

ننعی ابن عفان بأطراف الأسل
الموت أحلی عندنا من العسل

"ہم نیزوں کے کناروں کے ذریعے عثمان بن عفان کی شہادت کی خبر دیتے ہیں، موت ہمارے لیے شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔"

ردوعلینا شیخنا ثم بجل

"ہمارے شیخ (عثمان) ہمیں لوٹا دو، پھر یہی کافی ہے۔"

اس طرح اونٹ کی حفاظت کرتے ہوئے چالیس (یا ستر) افراد شہید ہوئے، حضرت عبدالرحمٰن عتاب، حضرت جندب بن زہیر،، عمرو بن اشرف، عبداللہ بن حکیم بن حزام، اسود بن ابوالبختری اور حضرت محمد بن طلحہ ان میں شامل تھے، اشتر نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر حملہ کیا، سر کی شدید چوٹ کے علاوہ انھیں ستر سے زائد زخم آئے۔ حضرت عبداللہ نے بھی وار کیا، لیکن وہ اوچھا پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تو حضرت عائشہ کے اصحاب نے انھیں چھڑایا۔ مروان بن حکم بھی زخمی ہوا۔ آخر کار ایک شخص نے تلوار کا وار کر کے اونٹ کا پاؤں کاٹ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ڈالا، وہ بلبلا کر سینے کے بل بیٹھ گیا، اس کی نکیل ٹوٹ گئی۔ اہل جمل منتشر ہوئے اور جیش علی نے اونٹ کا محاصرہ کر لیا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں: جنگ جمل سات دن جاری رہی۔

اس جنگ میں کوئی عام ہلہ نہ ہوا۔ عرب کے رواج کے مطابق دو بدو لڑائیوں (duels) کا ایک سلسلہ چلتا رہا۔ اس میں شدت اس وقت آئی جب لڑائی عسکر کے گرد مرتکز ہوئی۔ جنگ جمل کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں اتنے ہاتھ پاؤں کٹے کہ جنگ کے اختتام پر لوگ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئے۔ حضرت علی کے منادی نے اعلان کیا: جنگ سے بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، کسی زخمی پر وار نہ کیا جائے اور گھروں میں نہ گھسا جائے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۴۴۔ کنزالعمال، رقم ۳۱۶۶۹)۔ میدان جنگ میں بکھرے سامان کو بصرہ کی مسجد میں پہنچا کر اعلان کیا گیا، اپنا اپنا سامان شناخت کر کے لے جائیں۔ البتہ اسلحہ ضبط کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا گیا۔

حضرت عائشہ کا اکرام

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت قعقاع بن عمرو، محمد بن ابو بکر اور حضرت عمار بن یاسر نے سیدہ عائشہ کے کجاوے کے تسمے کاٹے اور اسے اٹھا کر لاشوں سے پرے رکھ دیا۔ اس میں اتنے تیر پیوست ہو چکے تھے، جتنے خار پشت کی پشت پر کانٹے ہوتے ہیں۔ اونٹ کے سرپوش کو زرہ بکتر کی شکل دی گئی تھی، اس لیے حضرت عائشہ کو فقط بازو پر ایک خراش آئی۔ پردے کے لیے چادریں تان دی گئیں، حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر اور تمام کمانڈروں نے ام المومنین کو سلام کیا، ان سے عزت و اکرام سے پیش آئے۔ محمد بن ابو بکر نے اپنی بہن کی خیریت دریافت کی، پھر انھیں بصرہ لے گئے۔

شہداے جنگ جمل

جنگ جمل میں طرفین کے دس ہزار اہل ایمان نے زندگی سے ہاتھ دھوئے۔ شہدا کی تعداد اس طرح بیان کی گئی ہے: جیش علی: پانچ ہزار، اصحاب عائشہ: پانچ ہزار، بنوضبہ، ایک ہزار، بنوعدی: ستر۔

بصرہ میں دخول

فتح کے بعد حضرت علی بصرہ میں داخل ہوئے تو تمام شہریوں سے بیعت لی، زخمی اور امان لینے والے بھی بیعت میں شامل ہوئے۔ انھوں نے بصرہ میں تین (پندرہ) دن قیام کیا، اس دوران میں میدان جنگ کا معاینہ

کیا، اپنے اور فریق مخالف کے شہدا کی بلا امتیاز نماز جنازہ پڑھائی اور ان کی تدفین کے انتظامات کیے۔ کعب بن سور کی میت کو دیکھ کر کہا: یہ بڑا عالم تھا، حضرت عبد الرحمٰن بن عتاب کے جثے کو دیکھا تو فرمایا: یہ قوم کا سردار تھا، حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے لاشے پر نظر پڑی تو دکھ کا اظہار کیا اور 'إنا للّٰه وإنا إليه راجعون' پڑھا۔ ان کے چہرے سے گرد و غبار صاف کیا اور روتے روتے اپنے بیٹے حضرت حسن سے فرمایا: کاش، میں اس سے پہلے فوت ہو گیا ہوتا (مستدرک حاکم، رقم ۵۵۹۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۵۱)۔

جنگ کے بعد بنو سعد کے احنف بن قیس حضرت علی سے ملنے آئے تو انھوں نے شکوہ کیا کہ تو ہمارا ساتھ دینے سے ہچکچاتا ہی رہا۔ احنف نے کہا: میرے خیال میں، میں نے اچھا ہی کیا، آپ بھی نرمی اختیار کیجیے۔ حضرت ابو بکرہ کے بیٹے عبد الرحمٰن ملنے آئے تو بتایا کہ ان کے والد بیمار ہیں۔ حضرت علی ان کی تیمار داری کرنے گئے اور انھیں بصرہ کا گورنر بننے کی پیش کش کی۔ حضرت ابو بکرہ نے کہا: گورنر آپ کے اہل خانہ میں سے ہونا چاہیے، میں اسے مشورہ دے دیا کروں گا۔ ان کے کہنے پر حضرت علی نے حضرت عبد اللہ بن عباس کو بصرہ کا گورنر اور زیاد بن ابیہ کو بیت المال کا ناظم مقرر کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ کو رخصت کرنا

جنگ کے بعد حضرت علی عبد اللہ بن خلف کے گھر گئے جہاں سیدہ عائشہ مقیم تھیں۔ عبد اللہ جیش عائشہ میں تھے، جنگ جمل میں شہید ہوئے، جب کہ ان کے بھائی عثمان نے حضرت علی کا ساتھ دیا اور شہادت پائی۔ ان کی والدہ صفیہ نے حضرت علی کو دیکھ کر بین کیا: اللہ تمھارے بیٹوں کو اسی طرح یتیم کر دے جیسے تو نے عبد اللہ کے بیٹوں کو یتیم کیا ہے۔ حضرت علی نے کوئی جواب نہ دیا اور حضرت عائشہ سے ملنے چلے گئے اور کہا: صفیہ نے ہمارے ساتھ مناقشہ کیا ہے، میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب یہ چھوٹی بچی تھی۔ ایک ازدی نے کہا: یہ عورت ہم پر غالب نہ آ سکے گی۔ حضرت علی نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا: کسی عورت کو ہرگز ایذا نہ دینا، چاہے وہ تمھاری عزت پامال کرے۔ ہمیں مشرکہ عورتوں سے اعراض کرنے سے روکا گیا ہے، یہ تو مسلمان ہیں۔ یکم رجب ۳۶ھ کو حضرت علی نے سیدہ عائشہ کو سواریاں، ساز و سامان اور بارہ ہزار درہم دے کر بڑے اہتمام کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا جہاں وہ حج تک مقیم رہیں۔ بصرہ کی چالیس عورتوں، حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابو بکر اور اپنے فرزندوں کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ خود بھی کئی میل تک ان کے ساتھ پیادہ پا چلے۔ بوقت رخصت حضرت عائشہ نے نصیحت کی: بچو، ایک دوسرے سے رنجور نہ ہونا۔ علی سے میری رنجش اتنی ہی تھی جتنی ایک

عورت کی سسرال والوں سے ہوتی ہے۔ حضرت علی بولے: آپ نے سچ کہا۔ حضرت عبداللہ بن جعفر نے حضرت عائشہ کو دی جانے والی رقم کو کم سمجھ کر خزانے سے مزید مال دیا اور کہا: امیر المومنین نے اگر اجازت نہ دی تو یہ مال میری طرف سے ادا ہو گا۔ حضرت علی نے حضرت عائشہ کی فوج میں شامل لوگوں کو بصرہ میں رہنے یا اپنے شہروں کو واپس جانے کی چھوٹ دے دی۔

بصرہ موجودگی کے دوران میں حضرت علی کو بتایا گیا کہ دو افراد عجلان اور سعد حضرت عائشہ پر سب و شتم کر رہے ہیں۔ انھوں نے حضرت قعقاع کو حکم دیا کہ ان کو کپڑے اتار کر سو درے لگائے جائیں۔

سپاہیوں کے عطیات: بیت المال سے

تمام اہل بصرہ سے بیعت لینے کے بعد حضرت علی نے بیت المال کی طرف توجہ کی۔ اس میں چھ لاکھ سے کچھ اوپر درہم تھے جو انھوں نے اپنے فوجیوں میں بانٹ دیے۔ ہر سپاہی کے حصہ میں پانسو درہم آئے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر شام میں فتح ہوئی تو اسی طرح عطیات دیے جائیں گے۔ اس باب میں سبائیوں (سبیئیوں) نے حضرت علی پر بہت طعنہ زنی کی، وہ بیت المال کے بجائے شکست خوردہ فوج کا مال اور خواتین بانٹنا چاہتے تھے۔ حضرت علی نے کہا: جو ہمارے مقابلے سے ہٹ گئے، ہمارے ہی جیسے مسلمان ہیں۔ تم میں سے کون چاہے گا کہ ام المومنین اس کے حصے میں آئیں (کنز العمال، رقم ۳۱۶۷۳)۔ بصرہ میں قیام پذیر ہو کر حضرت علی اصلاح احوال کرنا چاہتے تھے، لیکن انھیں جلد ہی یہاں سے کوچ کرنا پڑا، کیونکہ سبائی ان کی اجازت کے بغیر ہی آگے چل پڑے تھے۔ حضرت علی نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کی طرف سے اٹھائے جانے والے ممکنہ فساد کو بروقت فرو کیا جاسکے۔

جنگ جمل پر حضرت علی کے تاثرات

اے اللہ، میرا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان قتال ہو (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۵۷)۔

کاش، میں بیس برس پہلے گزر گیا ہوتا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۷۹)۔

مجھے ہرگز خیال نہ تھا کہ معاملہ کی نوبت یہاں تک پہنچے گی (البدایہ والنہایہ ۷/ ۴۱۸)۔

حضرت علی نے دونوں فریقوں کے شہدا کے لیے دعاے مغفرت کی (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۸۴)۔

حضرت علی نے حضرت عثمان کے قاتلوں کو بددعا دی (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۶۵۔ التاریخ الکبیر،

بخاری ۴/۳۴۳)۔

حضرت علی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے امید ہے، میں، طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں شامل ہوں گے جن کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہوا: 'وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ'، ''ان کے سینوں میں جو تھوڑی بہت کپٹ ہوگی ہم نکال دیں گے، یہ حال ہوگا کہ بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے'' (الحجر ۱۵: ۴۷) (ترمذی، رقم ۳۷۴۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۹۵۰)۔ایک بار انھوں نے یہی ارشاد ربانی اپنے اور حضرت عثمان کے تعلقات کی مثال دیتے ہوئے دہرایا۔

حضرت علی کا گزر وادی سباع میں حضرت زبیر کی قبر پر ہوا تو وہاں بیٹھ کر شدت غم سے گریہ زاری کی (طبقات ابن سعد ۳/۷۹)۔

حضرت طلحہ کے فرزند محمد بھی جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ ان کی قبر پر جب بھی حضرت علی کا گزر ہوا تو فرمایا: بہت عبادت گزار اور نیک نوجوان تھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ کی پشیمانی

جنگ جمل میں حصہ لینے کو حضرت عائشہ اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں، عمر بھر انھیں اس کا قلق رہا۔ جب وہ 'وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'، ''اے ازواج نبی، اپنے گھروں میں ٹک کر رہو'' (الاحزاب ۳۳: ۳۳) کی آیت تلاوت کرتیں تو رونے لگتیں، حتیٰ کہ ان کی اوڑھنی بھیگ جاتی۔ فرمایا: اگر مجھے بعد میں پیش آنے والے معاملات کا پہلے سے علم ہوتا تو علی کے خلاف خروج نہ کرتی۔

کوفہ روانگی

بصرہ کے مقامی انتظامات سر انجام دینے کے بعد حضرت علی نے کوفہ کی طرف رخت سفر باندھا۔ انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس کو بصرہ کا گورنر اور زیاد کو بیت المال کا نگران مقرر کیا۔ ۱۲/ رجب ۳۶ھ میں کوفہ میں داخل ہوئے تو ایک شخص نے عرض کیا کہ آں جناب قصر ابیض میں فروکش ہوں۔ حضرت علی نے کہا: میں اس میں نہیں رہوں گا، کیونکہ عمر شان دار محلات میں اقامت کو مکروہ جانتے تھے۔ انھوں نے کوفہ کی جامع مسجد میں دو رکعت نفل ادا کیے اور مسجد سے ملحق رحبہ میں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت علی نے اس وقت کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مدینہ کے بجائے کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا۔ جنگ جمل میں فتح کے بعد حضرت علی

کی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور کئی اطراف کے مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی۔

مطالعۂ مزید: الامامة والسیاسة (ابن قتیبہ)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، البدایة والنہایة (ابن کثیر)، سیر الصحابہ (شاہ معین الدین)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ جات: محمد حمید اللہ، L Veccia Vag Lieri)، سیرت علی المرتضیٰ (محمد نافع)۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد ذکوان ندوی

باحجاب بے حیائی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دور جدید میں ایک نیا ظاہرہ سامنے آیا ہے، اور وہ ہے خواتین کا ''مس ورلڈ'' اور ''مس یونی ورس'' وغیرہ بننا۔ عجیب بات ہے کہ بعض مسلم ممالک بھی اب اِس جاہلی دوڑ میں شامل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ حالیہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ مصر میں ہونے والے ''مقابلۂ حسن'' کے ایک پروگرام میں بڑی تعداد میں ''باحجاب مسلم خواتین'' نے حصہ لیا۔

اِس مقابلے میں ایک عرب دوشیزہ نسرین الکتانی (مراکش) کو دنیا کی پہلی ''باحجاب مس عرب'' (Veiled Miss Arab) قرار دیا گیا ہے۔ اِس موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے موصوفہ نے کہا کہ — مجھے فخر ہے کہ تاریخ میں میرا نام ایک ''باحجاب مس عرب'' (ملكة جمال المحجبات العرب) کی حیثیت سے درج کیا جائے گا۔

اِس قسم کا مقابلۂ حسن دراصل اُسی قدیم تہذیب کا جدید اعادہ ہے جس کے ایک ظاہرے کو قرآن میں 'تَبَرُّج' (الاحزاب ۳۳: ۳۳) کہا گیا ہے۔ اجنبی مردوں کے سامنے زیب وزینت کی نمایش بلاشبہ، جاہلیت کا طریقہ ہے۔ اِس قسم کی نمایش دین فطرت کے بھی خلاف ہے اور عقل وشرافت کے بھی خلاف۔

حجاب کوئی رسمی یا روایتی چیز نہیں، وہ حیا وشرافت کی علامت اور عصمت کی ضمانت ہے۔ حجاب کسی خاتون کے لیے عفت اور تزکیہ کا ایک فطری ذریعہ ہے۔ چنانچہ جب حیا ختم ہوجائے تو پھر مذکورہ قسم کا حجاب صرف

بے حیائی اور حیا باختگی کا اظہار ہو گا، نہ کہ عفت و عصمت کا اظہار: 'إذا لم تستح، فاصنع ما شئت' (بخاری، رقم ۳۴۸۹)۔

افسوس کہ شیاطین الجن والانس کی خوب صورت تزئین (الحجر ۱۵: ۳۹) کے ذریعے سے موجودہ زمانے میں ایمان و اخلاق کے تقریباً تمام پیمانے یک سر بدل چکے ہیں۔ یہ اِسی ابلیسی تزئین کا نتیجہ ہے کہ بے حیائی نے اب ''باحجاب بے حیائی'' کی صورت اختیار کر لی ہے:

تھا جو ناخوب، بہ تدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

(لکھنؤ، ۸ / جون ۲۰۱۸ء)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد تہامی بشر علوی

جھوٹ اور سچ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض برائیاں اس طرح کی ہوتی ہیں کہ گنتی میں وہ ایک یا دو ہی ہوتی ہیں، لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کینسر ایک مرض ہے، گننے میں تو یہ ایک ہی بیماری ہے، لیکن یہ ایسی موذی بیماری ہے کہ خدانخواستہ کسی شخص کو لگ جائے تو اس کی زندگی کو ہی خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

بعض اوقات ہم خیال کرتے رہتے ہیں کہ سو نیکیاں ہم نے کر لیں، ساتھ میں ایک گناہ بھی کر لیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری توجہ محض برائی کی گنتی پر نہیں، بلکہ اس برائی کی سنگینی پر ہونی چاہیے۔ زکام، بخار، کھانسی اور سر درد جیسی چند بیماریاں مل کر بھی اتنی خطرناک ثابت نہیں ہوتیں، جتنا کہ تنہا کینسر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

ایک اور مثال پر غور کر لیجیے، ایک شخص ہے، اس نے اٹھ کر کسی کو مکا مار دیا۔ مکا مارنا یقیناً ایک برائی ہے۔ ایک دوسرا شخص ہے، وہ موقع پا کر کسی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکال لیتا ہے۔ یہ بھی ایک برائی ہے۔ دیکھنے میں مکا مارنے والے جرم کا نقصان زیادہ ہوا کہ اس کی وجہ سے دوسرا شخص تکلیف میں مبتلا ہوا۔ سو روپے کھو جانے والے کا بظاہر کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا، لیکن غور کیجیے تو سو روپے جیب سے نکالنے والے کا جرم نتائج کے اعتبار سے سنگین ترین ہے۔ پہلا جرم شجاعت کی صفت کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہوا، جب کہ دوسرا جرم شخصیت میں پیدا ہو جانے والی خساست کی وجہ سے صادر ہوا۔ کوئی شخص خساست میں مبتلا ہو جائے، یہ بہت خطرناک بات ہے۔ خساست بذات خود ایک سنگین برائی ہے جو اس شخص کی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ جب کہ مکا مارنے والے شخص کی فطرت میں شجاعت کا وصف ہے، شجاعت اپنی اصل میں ایک وصف ہی ہے، البتہ اس

نے اس وصف کو درست استعمال نہ کر کے جرم کا ارتکاب کیا۔

انسان سے ایسی برائی صادر ہو جائے جو کہ اس کی شخصیت میں پیدا ہو جانے والی کسی برائی سے صادر ہو رہی ہو تو یہ کینسر کے مانند ایک مرض ہے۔ اپنی فطرت میں خساست پیدا نہیں ہونے دینی چاہیے۔ طبیعت میں پستی پیدا ہو جائے تو انسان کی اخلاقی اور روحانی شخصیت مکمل تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان کو اپنی کسی صلاحیت کے منفی استعمال کے گناہ سے بھی بہر حال بچانا چاہیے۔ اپنی شخصیت میں کوئی بدی پیدا نہیں ہونے دینی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں بھی مکا مارنے والے سے زیادہ جیب سے سو روپے نکالنے والے کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ ایسے شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔ شخصیت میں پستی اور خساست پیدا ہونے سے انسان جہاں چند خطرناک برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہیں وہ کئی اعلیٰ نیکیوں کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکیاں صرف انھی لوگوں کا نصیب بن سکتی ہیں جن کی شخصیت میں اعلیٰ خصوصیات ہوں۔ جو شخص خود میں اعلیٰ اوصاف پیدا نہیں کر سکتا، وہ کبھی کسی اعلیٰ نیکی کو کر لینے کی روحانی لذت حاصل نہیں کر سکتا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معاف کر دینا، گالی سن کر خاموش ہو جانا، طاقت کے باوجود بدلہ نہ لینا وغیرہ، وہ اعلیٰ ترین نیکیاں ہیں جو چھوٹی شخصیات کا حصہ بن ہی نہیں سکتیں۔ انبیا علیہم السلام کی سیرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں اعلیٰ نیکیوں سے بھرپور ملیں گی۔ وہ بہت آسانی سے معاف کر سکتے ہیں۔ وہ تکالیف سہ کر بھی انتقام کے جوش میں بے قابو نہیں ہو جاتے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ پیغمبروں میں شخصیت کے اعلیٰ خصائص اپنی اعلیٰ ترین شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ اتنی اعلیٰ خصائص کی حامل شخصیات کے لیے اعلیٰ ترین نیکیاں کر لینا پوری طرح ممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی شخصیت میں اعلیٰ اوصاف پیدا کرنا، البتہ محنت طلب کام ہے۔ ایک بھرپور انسانی شخصیت کی تعمیر بہت توجہ اور محنت کا کام ہے۔ دنیا میں جتنی بھی اعلیٰ نیکیوں سے لوگ واقف ہیں، ان کے پیچھے اعلیٰ شخصیات آپ کو ضرور ملیں گی۔ ایک انسانی شخصیت میں اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے کا کام اتنا آسان نہیں۔ الطاف حسین حالی نے کہا ہے نا کہ:

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

غالب نے اسی حقیقت کو اپنے منفرد انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بد قسمتی سے ہمارے زیر اثر انسانی وجود اعلیٰ شخصی خصائص سے محروم ہو چکے ہیں۔ کم فہمی کی وجہ سے والدین اپنی اولاد کی صلاحیتیں کچل دیتے ہیں۔ اساتذہ نااہلی کے باعث طلبہ کی صلاحیتیں تباہ کر لیتے ہیں۔ نتیجے میں انسانی شخصیت مکمل کھنڈر بن جاتی ہے۔ اب ایسی شخصیات سے کسی اعلیٰ نیکی کا صدور ممکن نہیں رہتا۔ معاشرے میں برائیاں اسی وجہ سے پھیل رہی ہیں کہ انسانی خصائص سے عاری لوگوں کی ہر طرف بہتات ہے۔ ایسے تباہ حال لوگوں سے بدی اور برائی ہی فروغ پا سکتی ہے۔ کسی انسان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے اعلیٰ انسان بننے میں اس کی مدد کی جائے۔ گرد و پیش میں انسانوں کا حال دیکھ کر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

خوف نا فہمیِ مردم سے مجھے آتا ہے
گاؤ خر ہونے لگے صورتِ انساں پیدا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جو شخص کھانا بر وقت نہ ملنے پر ماں پر طیش آزماتا ہے۔ اپنا کام نہ ہونے پر بہن سے لڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیوی پر عذاب بن جاتا ہے وغیرہ، یہ سب وہ حرکات ہیں جو ایک پست شخصیت سے ہی صادر ہو سکتی ہیں۔ آج ہر گھر اس قسم کے فسادات اور بے سکونی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر گھر پست انسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک گھر کا سکون تباہ کرنے کے لیے وہاں ایک پست انسان کا ہونا کافی ہے۔ انسانوں کی تربیت اور انھیں اعلیٰ اوصاف سے آراستہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ سماج میں امن کی فضا قائم ہو سکے۔ حقیقی اور پایدار امن پہلے کسی شخصیت کا حصہ بنتا ہے، پھر وہاں سے پھوٹ کر پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

مجموعی طور پر پستی کا شکار سماج اس قابل نہیں رہتا کہ وہ اپنی نسلوں کو اعلیٰ انسانی خصائص اپنانے میں مدد فراہم کر سکے۔ ایسے میں سماج میں چند لوگوں پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ وہ قوم کو متنبہ کرتے رہیں۔ وہ انھیں زندگی کے اعلیٰ اہداف کی طرف توجہ دلاتے رہیں۔ وہ زندگی کے بارے میں قوم میں حساسیت پیدا کرتے رہیں۔ یہ کام درست نہج پر شروع ہو جانے کے برسوں بعد کسی متوقع تبدیلی کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔ کھنڈر بنی سڑکوں سے زیادہ خوف ناک مسئلہ کھنڈر بنی شخصیات کا ہے۔ اس مسئلہ کا گہرا ادراک لازم ہے۔ قوم اس پستی سے درست تعلیم و تربیت کے بغیر کبھی نہیں نکل سکتی۔ جو لوگ کسی شارٹ کٹ راستے سے قوم میں کسی تبدیلی کی بات کرتے ہیں، وہ بلاشبہ ایک لایعنی بات کرتے ہیں۔ فطرت اپنا قانون کسی کے جذبوں کے احترام میں کبھی

نہیں بدل سکتی۔ شخصیت میں پستی گھس جائے تو آدمی مصلح بن کر بھی شہرت اور نام و نمود کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ یوں برائی کی اصلاح کے نام پر مزید خطرناک برائیوں کا چلن شروع ہو جاتا ہے۔

میں اس موقع پر سماج سے انسانی پستی اور اس کی وجہ سے پھیلی برائیوں کی مثالوں سے گریز کروں گا۔ یہ اصولی گفتگو ذہن نشین کر کے غور کر لیا جائے تو بنیادی مسئلہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ مصیبت مگر یہ ہے کہ غور و فکر کی عادت بھی کسی اعلیٰ انسان کی ہی خوبی ہوتی ہے۔ بہت بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے سماج میں غور و فکر کا عادی بندہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ جو کوئی نیکی کر بھی رہا ہو، بن سمجھے ایک رسم کے طور پر کر رہا ہو گا۔ اسے نیکی کا شعور میسر نہ ہو گا۔ آپ کسی سے گفتگو کر کے دیکھ لیجیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ لوگوں کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہے ہی نہیں۔ وہ بے معنی زندگی جی کر بے کار کی موت مر جاتے ہیں۔ ممکن ہے، پوچھنے پر لوگ یہ سنا سنایا جملہ دہرا بھی دیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد عبادت کرنا ہے۔ گفتگو بڑھانے پر آپ جان جائیں گے کہ اس جملے کا کوئی واضح مفہوم ان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ انھوں نے کبھی اس جملے پر غور ہی نہیں کیا ہوتا۔ محض سن کر یہی جملہ آگے بھی سنا دیا جاتا ہے۔ سننے اور سنانے والا اس پر چند لمحوں کا تدبر صرف کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں اس وقت اس خطرناک برائی کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کی نشان دہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی۔ یہ خطرناک بیماری جہاں موجود ہو، جان جائیے کہ وہاں لوگ انسانی اوصاف سے محروم ہو کر پستی کا جینا جی رہے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق یہ موذی مرض جھوٹ ہے۔ یہ ایسی بڑی بیماری ہے کہ خدانخواستہ یہ کسی انسان کو لاحق ہو جائے تو یہ پھر انڈے بچے دینا شروع کر دیتی ہے۔ کہنے میں تو بس یہ ایک برائی ہوتی ہے، لیکن یہ اتنی برائیاں پیدا کر دیتی ہے کہ آپ کو برائیوں میں پھنسی اپنی جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ جھوٹا شخص پست ترین شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی پستی تک اتر سکتا ہے۔ یہ مرض ایک نشے کی طرح پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک آدمی کو جھوٹ کی چاٹ لگ جائے تو جب تک یہ زندہ رہتا ہے، اس مرض میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے بے وجہ اور بالکل بے فائدہ جھوٹ بھی بولتا چلا جاتا ہے۔ اس کے چھوٹ جانے سے باقی برائیاں بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اپنا اور اپنے سماج کا جائزہ لیجیے تو بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص اس مرض میں خوب خوب مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور ہدایت دے، یہ بڑا سخت اور خطرناک مرض ہے جو ہماری زندگی کا ہوا اور پانی کی طرح حصہ بن چکا ہے۔

جو شخص جھوٹ بولتا ہے، اس میں بہت ساری برائیاں جمع ہوتی ہیں۔ جھوٹ بہت پست زندگی کی علامت ہے۔ جان بوجھ کر ایک ایسی بات کہنا جو حقیقت کے خلاف ہو، بہت بڑی دھوکا بازی ہے۔ وہ شخص انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں جو غلط بیانی سے کام لے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان اتنا پستی میں گر جائے کہ وہ غلط بیانی کر کے دوسروں کو دھوکا دے۔

ہماری پستی کا عالم تو یہ ہے کہ اس گھٹیا خصلت کو ہم اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ لوگ اپنے قریبی احباب کو فخریہ بتاتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو اس طرح الو بنایا ہے۔ لوگ دھوکا دینے کے ہنر کو اپنی ہوشیاری سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے سیانے دنیا کے گھٹیا ترین اور پست ترین لوگ ہوتے ہیں۔ اوپر سے بے وقوف اتنے ہوتے ہیں کہ اپنی اس پستی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ ایسے دھوکا بازوں کو، صادق اور امین رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے نکالا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا امتی ہو کر دوسروں کو دھوکا بھی دے دے، یہ خصلت میری امت کے لوگوں کی نہیں ہو سکتی[۱]۔ قرآن مجید میں سچائی پر قائم رہنے کا جو معیار ہمیں دیا گیا ہے، وہ سورۂ نساء میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اے اہل ایمان ہمیشہ انصاف پہ کھڑے رہنا، انصاف سے کبھی نہ پھرنا، اللہ کے لیے گواہ بنے رہنا۔ اور تم گواہی ہمیشہ اس سچائی کے ساتھ دو، اگرچہ تمھیں اپنے خلاف دینی پڑ جائے''[۲]۔

آپ نے کسی وجہ سے جذباتی ہو کر کسی کو برا بھلا کہہ دیا۔ اب جرگہ لگا ہوا ہے۔ فیصلہ کرنے والے لوگ آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ نے اس شخص کو ایسا کہا ہے؟ اب آپ کے ایمان اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ سچائی سے اعتراف جرم کریں اور کہیں کہ میرے خلاف یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مجھ سے جہالت اور جذبات میں یہ تلخ کلامی سرزد ہو گئی تھی، اب میں اس جرم پر اپنے بھائی سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ یہ نہ کریں کہ وہاں موقع پر کوئی انسان نہیں تھا تو چلیے مکر جاتے ہیں۔ اور یوں کہہ دیں کہ جی میں نے تو یوں کہا ہی نہیں تھا۔ یہ سچا ہے تو گواہ لائے۔ آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شخص پر دوسرا ظلم یہ ڈھا رہے ہیں کہ اس پر جھوٹ بولنے کا بہتان بھی باندھ رہے ہیں۔ اب سوچیے، خدا کی نظر میں وہ شخص کتنا پست ہوتا ہے جو ایک تو دوسرے کو برا بھلا کہتا ہے اور معذرت کرنے کے بجائے الٹا اسی کو جھوٹا قرار دلواتا ہے۔ یہ سنگین ترین جرم ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد آزادی کی تحریک کے پرزور رہنماؤں میں سے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف

۱۔ ترمذی، رقم ۱۳۱۵۔ 'من غش فليس منا'۔

۲۔ النساء ۴: ۱۳۵۔ 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ'۔

تقاریر کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھیں گرفتار کر کے چند کارندوں کو اس کام پر لگا دیا گیا کہ وہ ان کی وہ تقاریر جمع کریں جس سے ان پر حکومت کے خلاف بغاوت کا مقدمہ بن سکے۔ تقاریر جمع کرنے والوں سے ایسا ٹھوس مواد جمع نہ ہو سکا۔ مولانا آزاد نے خود اپنے قلم سے حکومت کے خلاف موقف لکھ کر پیش کر دیا۔ اور ساتھ یہ کہا کہ ''سچائی اس وجہ سے نہیں چھپائی جاسکتی کہ مخالف اسے سامنے لانے سے عاجز آ گیا ہے''[۳]۔

سچائی پر قائم رہنے والوں میں ایک مثال سقراط کی بھی ہے۔ یہ یونان کے علاقہ ایتھنز کا فلاسفر تھا۔ اس کی دل چسپی یہ ہوتی تھی کہ وہ سچائیوں کا ادراک حاصل کر سکے۔ اسے کڑھن ہوتی تھی کہ کیوں لوگ سچائی کو جاننا نہیں چاہتے۔ اور جو کوئی کسی سچائی کو اپنائے ہوئے ہے، وہ بھی اس سچائی کو اچھی طرح سمجھتا نہیں ہے۔ وہ لوگوں سے ان کی مانی ہوئی چیزوں کے حوالے سے سوالات کیا کرتا تھا یا درست تر الفاظ میں سوالات اٹھایا کرتا تھا۔ لوگوں کو اپنے مانے ہوئے تصورات سے عقیدت ہوتی ہے۔ وہ غلط سے غلط نظریے کو بھی ایک بار مان لیں تو اسے چھوڑنا ان کے لیے گراں ہو جاتا ہے۔ پھر معاشرے کا ایک ٹرینڈ سیٹ ہو جائے تو معاشرے کے بڑے کسی نئے ٹرینڈ کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نئے ٹرینڈ کے فروغ پانے کے بعد ان کی جھوٹی بڑائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ برادری والوں نے انبیا کی سچی دعوت کی مخالفت بھی اسی وجہ سے کی۔ سقراط کے اس سلسلے کو برادری والوں نے خطرے کی گھنٹی سمجھا۔ ان کے پاس اس کے سوالات کے تو کوئی جواب نہ تھے، انھوں نے یہی حل نکالا کہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس پر تین بڑے الزامات لگائے گئے کہ:

۱۔ یہ ہمارے نوجوانوں کو گم راہ کر رہا ہے۔

۲۔ یہ ہمارے دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔

۳۔ یہ کسی الگ خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔

چنانچہ ان تین جرائم کی پاداش میں برادری والوں نے اس پر سزائے موت جاری کر دی۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ آدمی کو زہر کا پیالہ پلایا جاتا تھا۔ سقراط کو بھی زہر کا پیالہ پلا دیا گیا تھا۔ جب اسے سزائے موت ہوئی تو ایتھنز کے لوگوں کے سامنے اس نے جو تقریر کی، وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ سچائی پر جان دے رہا ہے۔ سزائے موت دینے والے لوگ جھوٹ پر تھے۔ اسے اس سزا پر کوئی افسوس بھی نہ تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا تھا کہ تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے ایک بہت ذہین انسان کو بلاوجہ مار دیا ہے۔ پیالہ پینے سے پہلے اس

۳۔ قول فیصل، مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کا عدالتی بیان۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے شاگردوں اور دوستوں نے کوشش کی کہ سقراط ایتھنز کی ریاست چھوڑ کر بھاگ جائے۔ سقراط نے کہا کہ میں نے یہ خود کہہ رکھا ہے کہ سزا کا اختیار ریاست کے پاس ہو گا۔ اب میں خود بھاگ جاؤں تو یہ اپنے ہی نظریے کو جھٹلانے کے مترادف ہو گا۔ ایسی صورت میں میں جہاں جاؤں گا، وہاں سچائی کی تلقین کیسے کر سکوں گا؟ اس کے دوست جانتے تھے کہ محض موت کے ڈر سے سقراط نہیں بھاگ سکتا۔ اسے یہاں سے لے جانے کے لیے ہمیں ثابت کرنا ہو گا کہ سچائی کی راہ پیالہ پینے کے بجائے یہاں سے بھاگ جانا ہے۔ لیکن دوستوں کی گفتگو رائیگاں گئی، وہ اس پر ثابت نہیں کر سکے تھے کہ یہاں سے بھاگ جانا کس طرح سچائی ہے۔ بالآخر اپنے دور کا یہ عظیم انسان اپنے علاقہ والوں کے فیصلے کے نتیجے میں زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی طبیعت میں سچائی کی ایسی محبت رچ بس چکی تھی کہ اس کے لیے اس نے اپنی جان بھی دے دی[۴]۔

انبیاے کرام علیہم السلام تو تھے ہی سچائی کے پیمبر۔ انھیں بھی سچائی کی تلقین پر برادری والوں نے سخت سزائیں دیں۔ کئی انبیا کو تو قتل تک کیا گیا۔ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو لقب ہی صادق اور امین تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس سچائی کے ساتھ سچ پر قائم رہے، اس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سچائی کی تلقین پر جس اذیت سے دوچار ہونا پڑا، اس میں سے بہت کچھ ہمیں معلوم ہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ روش ماضی کے لوگوں کی ہی ہوا کرتی تھی۔ گو دنیا آج اس جہالت سے نکل چکی ہے، اب کسی کو محض بات کرنے سے، اپنا نظریہ پیش کرنے سے کہیں مارا نہیں جاتا۔ لیکن ہمارے برصغیر میں یہ جہالت ابھی بھی موجود ہے۔ آج بھی یہاں لوگوں کو عام ٹرینڈ سے ہٹ کر بات کہنے پر مارا جاتا ہے۔ انھیں اذیت پہنچائی جاتی ہے۔

مذہبی گروہ جھوٹے فتوے جاری کرتے ہیں۔ من گھڑت بہتانات باندھتے ہیں۔ آج ہمیں سقراط کی موت پر افسوس ہو رہا ہے، انبیا کو اذیت دینے والوں پر غصہ آ رہا ہے، لیکن غور کریں تو ہم بھی سچائی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ جہاں کہیں علم یا سچائی کی بات اٹھے گی، ہم فوراً مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ کسی سچی آواز کو اٹھنے ہی نہیں دیتے۔ آج کی اس دنیا میں سب سے جاہل اور بد تہذیب قوم ہم بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک کوشش کی کہ نئی نسل میں مطالعے کا ذوق پیدا کیا جا سکے۔ ان کا رشتہ کتاب و قلم سے جڑ سکے۔ اس مقصد کے لیے ایک رسالے کا اجرا کیا گیا۔ اس عمل میں تو کوئی برائی نہیں۔ لیکن اس عمل سے برادری والوں کو خوشی نہیں ہو گی۔ ان کی رگوں

۴۔ سقراط، کورا میسن، اردو ترجمہ: معاذ ہاشمی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں وہی جاہلانہ تشویشیں دوڑنے لگیں گی۔اور تو اور بعض مولوی صاحبان کو بھی اس سے سخت تکلیف پہنچنا شروع ہو گئی ہے۔ لوگوں کو ڈرا رہے ہیں کہ انھیں گم راہ کر دیا جائے گا۔ایسی جاہل اور بد توفیق روحیں آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے ہاں تو بے حساب ہیں۔ یہ نہ خود سچائیوں کی تلقین کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کی تلقین گوارا کر سکتے ہیں۔ان کے نصیب میں ہمیشہ سچائی کی مخالفت ہی رہی ہے۔ کم مقبول روحیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جو سچائی پا کر اسے سینے سے لگا لیتی ہیں۔ سچائی کو ٹھکرانے کا جرم وہ کبھی نہیں کرتیں۔

بات ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ جھوٹی گواہی کسی صورت میں مت دینا۔ اگر غلطی سے گناہ کر بھی لو تو بعد میں جب آپ سے گواہی طلب کی جائے تو سچی گواہی ہی دو، بھلے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ تمھارا معیار بہر حال یہی ہونا چاہیے۔ والدین کے خلاف بھی گواہی دینی پڑ جائے تو دے دو۔ آپ کے والد کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا تو والد نے برا بھلا کہنے میں پہل کر دی، موقع پر آپ موجود تھے۔ جب آپ سے بعد میں پوچھا جائے تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ پہل میرے والد کی تھی۔ اگر آپ والد کو بچانے کے لیے جھوٹی گواہی دیں گے تو آپ خدا کے مجرم ہوں گے۔ آپ کی جھوٹی گواہی سے ایک مظلوم کو انصاف نہیں مل پائے گا، اس کا وبال بھی آپ پر ہو گا۔ والدین ہوں یا رشتہ دار، بہر حال سچی گواہی ان کے خلاف ہونے کے باوجود اللہ کے حکم سے دے دی جائے گی۔

ایسے موقعوں پر سچی گواہی دینا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس موقع پہ اپنی خواہشات کے پیچھے چل کر عدل سے نہ پھر جانا۔ اپنوں کو بچانے کے لیے خواہشات کے لیے عدل سے پھر گئے تو یہ بڑا خطرناک ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر اگر تم نے گول مول بات کی یا آپ نے سچی گواہی سے اعراض کر دیا تو اتنا ضرور یاد رکھو کہ تمھارا یہ باطل عمل خدا کی نظروں میں ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے، لوگ بھلے نہ سمجھ سکیں، البتہ خدا اس کو اچھی طرح سمجھتا ہے، اور کل ہم سب نے اس کے روبرو پیش ہونا ہے۔ وہاں ہمارے ہر عمل کا حساب ہو کر رہے گا۔ پروردگار موت سے پہلے پہلے ہمیں اپنے اعمال درست کرنے کی توفیق بخشے۔

رضوان اللہ

عنِ ''البیان''

[''عنِ البیان'' کے عنوان سے یہ ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں اُن سوالات کو زیر بحث لایا جائے گا جو غامدی صاحب کی کتاب ''البیان'' کے ذیل میں محض تفہیم مدعا کی غرض سے پوچھے جاتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ!]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لَمْ یَحِضْنَ میں لَمْ کی دلالت

ایک آیت میں عدت کا حکم اس طرح سے بیان ہوا ہے:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ. (الطلاق ۶۵: ۴)

''تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا، ان کے بارے میں اگر کوئی شک ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہو گی۔''

''البیان'' میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''اصل میں 'وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'لَمْ' عربی زبان میں نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اِس سے وہ بچیاں مراد نہیں ہو سکتیں جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔'' (۵/ ۲۳۲)

اس پر سوال ہوا ہے کہ عربی زبان میں 'لَمْ' کا حرف نفی کے لیے آتا ہے اور یہاں 'لَمْ یَحِضْنَ' کا مطلب بس اتنا ہے کہ جنھیں حیض نہیں آیا۔ چنانچہ اس سے مراد بچیاں بھی ہو سکتی ہیں اور بڑی عمر کی عورتیں بھی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ''البیان'' میں صرف 'لَمْ' کی بنیاد پر نہایت قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیا گیا ہے کہ اس سے مراد بچیاں ہر گز نہیں ہو سکتیں؟

سوال کے جواب میں پہلی بات یہ واضح ہو جانی چاہیے کہ 'لَمْ' محض نفی کے لیے نہیں ہوتا کہ اس کے لیے عربی زبان میں 'ما' کا حرف ہوتا ہے، بلکہ اس کی نفی میں 'ما' سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے نفی جحد، یعنی انکار والی نفی کہا جاتا ہے۔ اب یہ انکار چونکہ کئی پہلوؤں سے ہو سکتا ہے، اس لیے زبان میں اس کے ایک سے زائد استعمالات ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، کبھی مقصود ہوتا ہے کہ فعل کی نفی کرتے ہوئے اس میں اتنی شدت پیدا کر دی جائے کہ اس کے بارے میں ہر عقلی امکان کا بھی انکار ہو جائے۔ ذیل کی آیت میں یہ اسی لحاظ سے آیا ہے:

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ. (الاخلاص ۱۱۲: ۳) ''وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا۔''

یہ امکان اگر حقیقی ہو تو بعض اوقات اندیشے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی نفی کرنے کے لیے بھی 'لَمْ' لایا جاتا ہے، جیسا کہ اُحد کے بعد کی مہم میں اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کو کوئی بڑا نقصان پہنچ جائے، مگر فرمایا ہے:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ. (آل عمران ۳: ۱۷۴) ''سو وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر (اِس مہم سے) واپس آئے، ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔''

فعل کی نفی کرتے ہوئے یہ وقت کے مفہوم پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے اور کبھی صرف ماضی میں اور کبھی ماضی سے لے کر حال تک میں اُس فعل کا انکار کر دیتا ہے۔ اول الذکر کی مثال یہ آیت ہے:

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا. (الدھر ۷۶: ۱) ''کیا انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔''

ثانی الذکر کی مثال یہ ہے:

لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا. (مریم ۱۹: ۴) ''اور اے پروردگار، تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں رہا۔''

وقت کے اسی مفہوم کی رعایت ہوتی ہے کہ اسے کسی متوقع بات کی نفی کے لیے بھی برت لیا جاتا ہے۔ یہ بات ماضی میں بھی ہوتی ہے اور مستقبل میں بھی۔ یعنی اس کے ذریعے سے اُس بات کی نفی بھی کی جاتی ہے جس کی اس سے پہلے امید کی جارہی تھی اور اس سے اُس بات کی توقع بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی اب نفی کر دی گئی ہے[1]۔ پہلے کی مثال میں وہ آیت دیکھ لی جائے جس میں فرمایا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں خراب نہیں ہوئیں، حالاں کہ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ وہ گل سڑ جاتیں:

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ. (البقرہ ۲: ۲۵۹)

''اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، ان میں سے کوئی چیز سڑی نہیں۔''

دوسرے کی مثال میں وہ آیت دیکھ لی جائے جس میں فرمایا ہے کہ ہم نے تمھیں اُس زمین کا بھی وارث بنا دیا ہے جس پر تمھارے قدم نہیں پڑے، مطلب یہ کہ آنے والے وقت میں امید ہے کہ ایسا ہو جائے:

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا. (الاحزاب ۳۳: ۲۷)

''اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تمھیں وارث بنا دیا اور ایک ایسی زمین کا بھی جس کو تمھارے قدموں نے چھوا بھی نہیں ہے۔''

حرف 'لَمْ' کے یہ تمام استعمالات اس میں اصلاً موجود ہوتے ہیں، مگر کس مقام پر کون سا پہلو مراد لیا گیا ہے، یہ جاننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کلام کے فحوا کو معلوم کیا جائے۔ سو اس نظر سے دیکھا جائے تو بہ ادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں طلاق دی ہوئی عورتوں کی عدت بیان ہو رہی ہے۔ اب عدت کی پابندی چونکہ اولاد کی وجہ سے ہوتی ہے کہ جس کا امکان بچیوں کے معاملے میں بالکل نہیں ہوتا، اس لیے طے ہے کہ یہاں صرف وہ عورتیں مراد ہیں جو اولاد پیدا کرنے کی عمر میں ہیں۔ مزید یہ کہ 'وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ' میں حیض سے مایوس عورتوں کا بیان ہو چکا ہے، اس لیے 'وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ' میں لازماً اُن عورتوں کا ذکر ہے جو اولاد پیدا کرنے کی عمر میں تو ہیں، مگر غیر آئسہ ہیں۔ اب ان عورتوں کے بارے میں جب یہ کہا جائے: 'لَمْ يَحِضْنَ' تو اسے پڑھ کر یہی متبادر ہوتا ہے کہ 'لَمْ' یہاں محض نفی کے لیے نہیں، بلکہ ماضی میں متوقع فعل کی

۱۔ وقت کے مفہوم سے توقع کا معنی کس طرح سے پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے اردو زبان میں 'ابھی' کا استعمال دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کہا جائے کہ یہ کام ابھی نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام متوقع تھا، مگر ابھی تک نہیں ہوا۔ اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام ابھی تو نہیں ہوا، مگر اس کے ہونے کی توقع ضرور ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نفی کے لیے آیا ہے اور اب اس میں وہی عورتیں مراد ہیں جو غیر آئسہ ہیں اور اولاد پیدا کرنے کی عمر میں بھی ہیں، مگر اُنھیں ابھی تک حیض نہیں آیا۔

بلکہ ہم عرض کریں کہ 'لَمۡ یَحِضۡنَ' کا جو مطلب فحوائے کلام کی دلالت اور حرف 'لَمۡ' کی تعیین سے واضح ہوتا ہے، اس کی تائید میں مزید قرائن بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اُن کے بارے میں 'اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ' کے الفاظ آئے ہیں [۲]، یعنی یہ عدت اُس صورت میں ہے جب اُن سے خلوت ہو چکی ہے اور اس وجہ سے شک پیدا ہو گیا ہے کہ انھیں حیض نہ آنے کے باوجود شاید ان کے رحموں میں کچھ ہو۔ ظاہر ہے، یہ بات بھی چھوٹی بچیوں کے بجائے بڑی عمر ہی کی عورتوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ 'وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ' کے 'وَّالّٰٓـِٔیۡ' کو کھول دیں تو اب اس کی تالیف یہ بنتی ہے: ' وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ'۔ اس میں 'تمھاری عورتوں' کے الفاظ بذات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہاں بڑی عورتوں کا ذکر مقصود ہے، اس لیے کہ شادی اور طلاق کے پس منظر میں ان الفاظ کا مطلق استعمال چھوٹی عمر کی بچیوں کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

اب جہاں تک ''البیان'' میں لکھے گئے وضاحتی نوٹ کا معاملہ ہے تو ہم عرض کریں کہ اس کے پیچھے مذکورہ بالا یہ تمام دلائل موجود ہیں، البتہ اس میں صرف 'لَمۡ' کی دلالت کے ذکر پر اس لیے اکتفا کر لیا گیا ہے کہ مصنف کے نزدیک ہر حرف کے مرادی پہلو کی تعیین اور اس کے دلائل کو ہر ہر مقام پر بیان کرنا ضروری نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کتاب میں جب 'لَمۡ' کے دیگر پہلوؤں کو بھی اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بالعموم اُن کی تعیین کے دلائل بیان نہیں کیے جاتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بیان تخلیق میں حیرت کا پہلو

انسان کی پیدایش کا بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ثُمَّ جَعَلۡنٰہُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ. ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً

۲۔ یہاں کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ 'اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ' کے الفاظ 'وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ' کے ساتھ مذکور نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ لفظوں میں چاہے نہ ہوں، مگر اس کے حکم میں ہر طرح سے موجود ہیں۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.(المؤمنون ۲۳: ۱۳-۱۴)

ان آیات کے تحت ''البیان'' میں یہ وضاحت کی گئی ہے:

''یہ دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جس کے بعد انسان ماں باپ کے پیٹ سے پیدا ہونا شروع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ اِس کی جو تفصیل آگے بیان ہوئی ہے، وہ معلوم و معروف ہے۔ دور جدید کا انسان اپنے مشینی مشاہدات کی بدولت اِس کی جزئیات تک سے واقف ہو گیا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اُس نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ حیرت انگیز طور پر اُس کے مشاہدات کے عین مطابق ثابت ہوا ہے۔''(۳/۳۸۴)

اس وضاحت پر سوال ہوا ہے کہ قرآن اپنے مخاطبین پر ان کے موجود علم کی بنیاد پر اتمام حجت کرتا ہے، اس لیے طے ہے کہ جب ان کے سامنے پیدایش کے ان مراحل کا ذکر کیا گیا تو وہ ان سے پہلے ہی سے واقف تھے۔ مزید یہ کہ سائنسی مشاہدات کے ذریعے سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ بھی قرآن کے کسی بیان کی نہیں، بلکہ اُسی ابتدائی علم کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ اس تفصیل کی قرآن کے ساتھ مطابقت کو ''البیان'' میں قرآن کا اعجاز کیوں کہا گیا اور اسے حیرت انگیز کیوں قرار دے دیا گیا ہے؟

یہاں ایک بنیادی بات واضح ہو جانی چاہیے۔ اس طرح کی تمام آیات کے معاملے میں اہل علم کے ہاں دو انتہائی رویے پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ ہر آنے والی سائنسی تحقیق کا سہرا قرآن کے سر باندھ دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ سب تو اس کتاب میں چودہ سو سال پہلے بیان ہو چکا۔ دوسرے یہ کہ قرآن اپنے مخاطبین کی ہدایت کے لیے صرف اُن حقائق کو بیان کرتا ہے جن کا وہ پہلے سے علم رکھتے ہوں، اس لیے کہ اُس علم ہی کی وجہ سے اُن پر دلیل قائم ہوتی اور اتمام حجت ہوا کرتا ہے[۳]۔ ہم عرض کریں گے کہ حق بات ان دو انتہاؤں کے درمیان میں ہے۔ وہ یہ کہ قرآن اپنی اصل میں ہدایت کی کتاب ہے، اس لیے حصول علم کے بجاے حصول ہدایت کو ہدف بنا کر اس میں مضامین بیان ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف کردہ کوئی کتاب نہیں، بلکہ تمام عالموں کے پروردگار کی طرف سے اُتاری ہوئی ایک کتاب ہے، چنانچہ اس میں نہ صرف مخاطبین کے موجود علم کی رعایت کی جاتی ہے، بلکہ بارہا اُن کے علم میں وہ باتیں بھی لائی جاتی ہیں جن سے وہ ناواقف محض

۳۔ واضح رہے کہ اتمام حجت صرف مخاطبین کو حاصل مشاہداتی علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اور بھی کئی بنیادیں ہوتی ہیں کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوتے ہیں۔ یہ باتیں جس طرح آخرت کی دنیا سے متعلق ہوتی ہیں، اسی طرح دنیا اور اس کے احوال کے بارے میں بھی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن نے انسان کی پیدایش مٹی اور ماں باپ کے ذریعے سے ہونے کے جب دو مرحلے بیان کیے ہیں[4] یا چھ مختلف ادوار میں کائنات کو بنانے کا ذکر کیا ہے[5] یا ہمارے زمین و آسمان کے علاوہ چھ مزید زمین و آسمان کے موجود ہونے کا بیان کیا ہے[6] تو یہ اصل میں اپنے مخاطبین کے علم میں اضافہ ہی کیا ہے۔ سو قرآن کی تفہیم میں اس مغالطے کو ہر گز راہ نہیں دینی چاہیے کہ اس میں مخاطبین کے سامنے صرف اُن باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس زمانے میں اُن کے اپنے علم میں تھیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں وہ کیا چیز بیان ہوئی ہے جسے ''البیان'' میں معجزہ اور حیرت انگیز قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ دو باتیں ہیں، اور ان میں سے اول بات کو سمجھنے کے لیے ہم پہلے ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، کارخانے کے بند کمرے میں ایک خود کار مشین پر کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ عام طور پر، اس میں سے کپڑا تیار حالت میں باہر نکلتا ہے، مگر کبھی کبھار اس میں سے ویسٹیج بھی باہر آتی ہے جو کبھی دھاگے کی شکل میں ہوتی ہے تو کبھی اَدھ بنے ہوئے کپڑے کی شکل میں۔ کمرے سے باہر ایک بچہ کھڑا ہے اور اُس کا علم بس اتنا ہے کہ وہ مشین سے نکلنے والی کپڑوں کی ان مختلف صورتوں سے واقف ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے اس علم کی بنیاد پر کبھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کپڑا کس طرح سے بنتا ہے۔ یہ بتانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس کمرے کے اندر دیکھ لینے کی صلاحیت ہو۔ اب مشین کو آپریٹ کرنے والا شخص اسے بتاتا ہے کہ بیٹا، یہ کپڑا اِس مشین پر میں تیار کرتا ہوں اور اس کے بعد اسے دھاگے سے لے کر کپڑا بننے تک کا پورا عمل بھی بتاتا ہے کہ پہلے میں دھاگا لیتا ہوں، اسے تانے بانے کی شکل دیتا ہوں اور اسے مشین پر چڑھا کر آخر کار کپڑے کی صورت دے دیتا ہوں۔ واضح سی بات ہے کہ اس شخص کی بتائی ہوئی یہ تفصیل اُس بچے کے لیے ایک بالکل نئی بات ہو گی اور یہ جاننے کے باوجود نئی بات ہو گی کہ ایک دھاگا ہوتا ہے، ایک تانا بانا اور ایک کپڑا۔ اب فرض کیجیے اس بچے سے یہ ساری تفصیل ایک دوسرے بچے نے سن رکھی ہے اور اُس دوسرے کو یہ موقع بھی مل جاتا ہے کہ وہ اس کمرے میں جھانک کر خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا عمل دیکھ لے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب دیکھ لینے کے

۴۔ السجدہ ۳۲: ۷-۹۔

۵۔ حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۱۲۔

۶۔ الطلاق ۶۵: ۱۲۔

بعد وہ انتہائی حیرت میں جا پڑے گا کہ میں نے جھانک کر دیکھا تو جانا، مگر اس نے بنا دیکھے کس طرح سے اسے جان لیا۔

اسی طرح کی بات ان آیات میں بیان ہوئی ہے۔ اُس زمانے کے اہل عرب 'علقة' سے بھی واقف تھے اور 'مضغة' اور 'عظام' سے بھی کہ یہ اُن کی اپنی زبان میں استعمال ہونے والے عام الفاظ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سے جنین پہلے اور بوٹی اور ہڈیوں کے مرحلے بعد میں ہوتے ہیں کہ ان کے گردوپیش میں مختلف ارتقائی عمل واقع ہو رہے اور خود اُن کے اپنے درمیان میں اِسقاط حمل کے کئی واقعات رونما ہو رہے تھے[7]۔ مگر اس جزئی اور نتیجوں کے علم کی بنیاد پر وہ اس حیثیت میں ہرگز نہ تھے کہ انسان کے تخلیق ہونے کا عمل بھی بتا سکیں[8]۔ اور بفرض محال، اگر وہ اپنے ان مشاہدات کی بنا پر اندازہ کرتے ہوئے یہ بتا بھی دیتے تو اس میں شک نہیں کہ اس میں درست اور غلط ہونے کے احتمالات اُس وقت تک موجود رہتے، جب تک کسی یقینی ذریعے سے اسے جان نہ لیا جاتا۔ قرآن نے اصل میں یہ کیا ہے کہ اُس زمانے کے موجود علم سے آگے بڑھ کر انسان کی تخلیق کا یہ عمل بنا کسی تردد کے بیان کر دیا ہے اور مزید یہ ہوا ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا، اُس کی جدید علم میں تردید کے بجائے تصدیق بھی ہو گئی ہے۔ اب ظاہر ہے، سائنسی علوم کے ماہرین کے لیے آج یہ بات حد درجہ حیرت کا باعث ہو جائے گی کہ صدیوں پہلے اس عمل کو کس طرح سے جان لیا گیا، اور مزید برآں یہ کہ اِس کامل درستی کے ساتھ اسے کس طرح سے بیان کر دیا گیا۔ سو قرآن کا یہی اعجاز ہے اور سائنس کے طلبہ کی یہی حیرت ہے کہ جس کا ''البیان'' میں ذکر کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں ہو سکتا ہے کہ قرآن کے اسلوب سے اجنبیت کی وجہ سے بعض لوگوں کے لیے اس تخلیقی عمل کے بیان کو اپنی گرفت میں لے لینا ذرا مشکل ہو اور اس لیے ''البیان'' میں بیان کردہ حیرت کا ذکر بھی ان کے لیے اب تک ناقابل فہم ہو۔ اس پر ہم گزارش کریں گے کہ وہ مذکورہ آیات کا بار بار مطالعہ کریں اور اس ذیل میں یہ

۷۔ اور یہی چیزیں ہیں جنھیں ''البیان'' میں ''معلوم و معروف'' قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ جدید تعلیم سے دور اور خالص دیہاتی ماحول میں بچہ جنانے والی کوئی عورت اِس معاملے میں پرانے زمانے کے اہل عرب کے بالکل برابر ہے۔ وہ بھی صرف یہ بتائے گی کہ اُس نے ابتدا سے لے کر انتہا تک بچوں کی فلاں اور فلاں صورتیں دیکھ رکھی ہیں، مگر اس بنا پر وہ کبھی آپ سے یہ نہیں کہے گی کہ آؤ، میں تمھیں بتاؤں کہ بچے کی تخلیق کا عمل کس طرح سے ہوتا ہے۔

بات بھی سامنے رکھیں کہ ان آیات میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ایک جنین ہوتا ہے اور ایک بوٹی اور ایک اُس کی ہڈی۔ نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جنین انسان کی بالکل خام اور بوٹیاں اور ہڈیاں اُس کی پختہ صورت ہوتے ہیں، بلکہ اس میں انسان بننے کا پورا عمل بیان کیا گیا ہے جو ایک حقیر نطفے سے شروع ہوتا اور مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے ایک جیتا جاگتا انسان بن جانے پر منتج ہوتا ہے۔ ان میں تخلیق کے عمل کا بیان ہوا ہے، اس بات کی دلیل اگرچہ 'وَلَقَدْ خَلَقْنَا' اور 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' کے الفاظ بھی ہیں کہ جن میں سے اول الذکر تو یہ بتاتے ہیں کہ یہاں خدا کے خالق ہونے کا بیان ہو رہا ہے، مگر ثانی الذکر بتاتے ہیں کہ تخلیق کس طرح سے ہوتی ہے، یہاں اس کا بھی بیان ہو رہا ہے۔ سیاق میں اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مذکورہ آیات میں بعد از موت زندگی کے منکرین کو جواب دیا گیا ہے کہ ہم اسے دوبارہ زندگی دے دینے پر بھی قادر ہیں، سو واضح کیا گیا ہے کہ ہم ہی ہیں جو آج بھی اسے بناتے اور اس طریقے سے بناتے ہیں۔ تاہم اس بات کی اصل دلیل ذیل کے جملوں اور ان کی ساخت میں پائی جاتی ہے جو ہر طرح سے واضح کر رہے ہیں کہ ان کے ذریعے سے یہاں تخلیق کے عمل ہی کا بیان ہوا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"پھر پانی کی اس بوند کو ہم نے ایک جنین کی صورت دی اور جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کی ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔"

دوسری چیز کہ جسے حیرت انگیز قرار دیا جا سکتا ہے، وہ ان آیتوں میں بیان کردہ بعض معلومات ہیں۔ اُس زمانے کے اہل عرب یہ بات تو جانتے تھے کہ بچہ جسم اور روح کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ روح اُن کے نزدیک مختلف صلاحیتوں، جیسا کہ سننا اور سوچنا وغیرہ کا ذریعہ تھی، مگر وہ اس بات میں ہرگز واضح نہیں تھے کہ یہ جسم اور صلاحیتیں ایک ہی وقت میں تخلیق پاتے ہیں یا اس عمل میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔

قرآن نے 'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ' کے الفاظ لا کر واضح کر دیا ہے کہ ماں کے پیٹ میں پہلے بچے کے حیوانی وجود کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب اسے انسانی درجے کی صلاحیتیں عطا کی جاتی ہیں۔ آج یہ بات ہمارے لیے باعث حیرت ہے، جب ہمیں بھی مختلف ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ماں کے پیٹ میں واقعتاً جسم کی اصل تیاری کے بعد ہی وہ مرحلہ آتا ہے جب بچہ سننا اور سوچنا، بلکہ سیکھنا بھی شروع کر دیتا ہے۔

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ صاحب ''البیان'' چونکہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھنے کے عادی ہیں، اس لیے انھوں نے قاری کی ذہانت پر اعتبار کرتے ہوئے اپنے وضاحتی نوٹ میں بعض تصریحات کو چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر یہ تصریحات لفظوں میں بیان کر دی جاتیں تو زیر بحث سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ساجد حمید

زاہد حسین: برادر منفرد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میرے بھائی زاہد اللہ کے حکم سے بروز عید[۱] پونے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ان کی اچانک موت ہمارے لیے سانحہ سے کم نہیں، لیکن ان کی خوے دیرینہ یہی تھی کہ پنج وقتہ داعی کے بلاوے پر آؤ دیکھا نہ تاؤ چل پڑتے تھے۔اس معاملے میں نہ بارش نہ پالا، نہ کھانا نہ پینا، کوئی چیز رکاوٹ نہیں تھی۔عید کے روز بھی انھوں نے ایسا ہی کیا کہ ادھر بلاوا آیا، ادھر چل دیے، ہم غالب کی طرح یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ:

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور[۲]

ہر اچانک موت پر لواحقین کو تا دیر یقین نہیں آتا، ہم انھیں سپرد خاک کر کے بھی گمان رکھتے ہیں کہ ابھی وہ مسجد کے بلاوے پر قمیص کا دامن سیدھا کرتے ہوئے چل پڑیں گے۔ہمارے دیگر خاندانی اوصاف کے علاوہ، دو اوصاف میں زاہد ہم سب سے بڑھ کر تھے: خودداری جو حد سے متجاوز تھی، اور دوسرے اپنے درست ہونے کا یقین۔پہلے وصف کے حد سے متجاوز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی کا یہ احسان بھی نہ لیں کہ مجھے تکلیف

۱۔ ۱۲ / اگست ۲۰۱۹ء۔

۲۔ داد و ستد: لین دین۔ ملک الموت: موت کا فرشتہ۔

ہے، ہسپتال لے چلو، یہ تعاون لینا اس خود داری کے خلاف ہوتا تھا۔ دوسرے وصف کا کمال یہ ہے کہ میرا ہر اقدام درست ہے، حد یہ کہ میرے تمام گمان بھی سو فی صد درست ہیں۔ یہ چیز انسان کو دوسرے کا موقف سمجھنے اور قبول کرنے میں حارج ہوتی ہے۔

زاہد نو عمری ہی سے حاضر دماغ، چہل گو، لطیفہ باز، مگر بے داغ کردار کے مالک تھے۔ استاذ گرامی جاوید احمد غامدی کی ان سے شروع ہی سے بے تکلفانہ دوستی تھی، استاذ نے ان کا نام سیوطی [۳] رکھ چھوڑا تھا۔ زاہد نام سے کبھی نہیں پکارا، سیوطی کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ ہم سے زاہد کی عدم موجودگی میں حال بھی پوچھتے تو اسی نام سے۔ ہم سب بھائیوں کے مقابلے میں زاہد ہی ان سے بے تکلف تھے، اب خالد اور کسی حد تک امجد بھی، بے تکلف ہیں، لیکن زاہد کے جیسے نہیں۔ طالب محسن، میں، عابد اور شجاع غامدی صاحب کے ساتھ از روے طبع زیادہ بے تکلف نہیں ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارے والد مرحوم پاکپتن میں اپنے پیر صاحب کی وجہ سے مقیم تھے۔ ہمارا گھر ریلوے روڈ سے پیر قریاں کو جانے والی سڑک پر تھا۔ پیر قریاں، غالباً ''پیر قریہ'' کا پنجابی تلفظ ہے، یعنی پیر کا نگر یا بستی۔ والد صاحب اپنی کمائی کا بڑا حصہ پیر صاحب اور ان کی اولاد پر خرچ کرتے تھے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ کمائی کا ساٹھ ستر فی صد تک ان کو دے آتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے گھر میں پیر صاحب اور ان کے اہل خانہ کے لیے ایک طرح کا نفرت پر مبنی غصہ موجود تھا۔ پیر قریاں کی مسجد میں بچے اور بچیاں ناظرہ قرآن کی تعلیم پاتے تھے، اس وقت کے قاری صاحب نے کوئی نازیبا حرکت کر دی، پورے پاکپتن میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ پیر صاحب کے لیے بھی باعث شرمندگی تھا کہ وہ ان کا مرید بھی تھا اور مقرر کردہ امام بھی۔ اس کو مسجد کی امامت سے ہٹا دیا گیا۔ بچیوں کے لیے فیصلہ ہوا کہ ان کو اب مسجد نہیں بھیجا جائے گا، بلکہ پیر صاحب کے مریدوں کی بیویاں یہ ذمہ داری نبھائیں گی۔ چنانچہ پیر صاحب نے خواتین کا امتحان لیا تو والدہ مرحومہ کے بقول صرف تین خواتین منتخب ہوئیں، جن میں میری والدہ بھی شامل تھیں۔

ان دنوں قرآن کے نسخے گھروں میں عام نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے گھر میں تھا، لیکن بس ایک ہی نسخہ تھا۔ والدہ نے دوسرے تیسرے دن پیر صاحب کے پوچھنے پر بتایا کہ ہاں بچیاں قرآن پڑھ رہی ہیں، لیکن ان کو مشکل پیش آ رہی ہے، اس لیے کہ ان کے پاس قرآن کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اگر طالبات کے سامنے سیدھا رکھتی

۳۔ جلال الدین سیوطی امت کے اکابر اہل علم میں سے ہیں، جو اسیوط کے رہنے والے تھے۔

ہوں تو میرے سامنے الٹا ہوتا ہے، جس سے مجھے پڑھانے میں تنگی ہوتی ہے اور غلط پڑھنے کا امکان رہتا ہے۔ پیر صاحب نے اپنا زیر مطالعہ قرآن کا نسخہ والدہ کو دیا کہ یہ اپنے سامنے رکھ لیا کریں اور دوسرا طالبات کے سامنے۔ والدہ بتاتی ہیں کہ میں وہ نسخہ لے کر گھر آگئی، جس کی وجہ سے بہ آسانی پڑھانے لگی۔ یہ نسخہ میں نے دیکھا ہوا ہے، بڑے سائز کا مترجم قرآن، جس میں آیتوں کے نمبر نہیں لگے ہوئے تھے، صرف دائروں کی صورت میں آیت کے نشان تھے۔ اس پر شنیل (velvet) کا غلاف ہوتا تھا، جسے جُزدان کہتے تھے۔ یہ جزدان شہید ہونے پر تبدیل کر لیا جاتا تھا، مگر پھینکا نہیں جاتا تھا، بعض اوقات بوسیدہ جزدان اتارے بغیر نیا اسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس نسخے میں احمد رضا خان بریلوی صاحب کا ترجمہ تھا۔

والدہ کہتی ہیں کہ ایک دن میری توجہ ہوئی کہ یہ قرآن تو مترجم ہے، لہٰذا میں نے ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ترجمہ پڑھنے سے یہ ہوا کہ ان کا ذہن تبدیل ہونے لگا۔ انھوں نے اپنے پیر صاحب سے ایک دن کہا کہ جو باتیں آپ کرتے ہیں، وہ تو قرآن میں نہیں، بلکہ قرآن تو ان کے خلاف ہے۔ یوں والدہ پیری فقیری سے برگشتہ ہوئیں۔ اس عمل نے ہمارے گھر میں پیروں کے ''تقدس'' کو کم کر دیا۔ لہٰذا، ہمارے دلوں میں جو نفرت اور غصہ تھا، اسے اس سے تقویت ملی۔ ہمارے برعکس، زاہد کے دل میں یہ نفرت عملی صورت اختیار کر گئی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مثلاً، ایک جون کی دوپہر کا واقعہ ہے کہ والدہ نے زاہد کے ہاتھ کچھ کھانے کی چیز پیر صاحب کے گھر بھیجی، زاہد پیروں کے گھر گیا، وہ کھانا انھیں دیا اور واپسی پر ان کی ڈیوڑھی میں لگے مین سوئچ کو آف کر آیا۔ انھوں نے کافی دیر یہی خیال کیا کہ بجلی بند ہے۔ پیر صاحب اور ان کے اہل خانہ دوپہر بھر گرمی کی تکلیف اٹھاتے رہے، عصر کی اذان سن کر انھیں خیال آیا کہ مسجد میں تو بجلی آ رہی ہے، خرابی ہمارے گھر میں ہے۔ الیکٹریشن کو بلایا گیا تو پتا چلا کہ مین سوئچ بند ہے۔ بچوں سے پوچھا، سب نے کہا کہ ہم نے تو بند نہیں کیا۔ پوچھ گچھ کے بعد انھیں خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ زاہد کا کیا دھرا ہے، کیونکہ دوپہر کو وہی آیا تھا۔ عصر سے کچھ بعد پیر صاحب کی بڑی بہو، جو ہماری والدہ سے بڑی تھیں، ہمارے گھر زاہد کی شکایت کرنے آئیں۔ والدہ نے ان کے شایان شان مہمان نوازی کی، لیکن اسی دوران میں جب وہ زاہد کی شکایت کر رہی تھیں، زاہد نے باہر کھیت سے باجرے کا سٹا لا کر ان کے پائنچے میں اٹکا دیا، انھیں محسوس ہوا کہ کوئی چیز ہے، انھوں نے شلوار کو دو تین بار جھٹکا، جس سے سٹا اوپر چڑھتا گیا، انھیں خیال ہوا کہ کوئی کیڑا ہے، مگر جب دیکھا تو سٹا تھا۔ ان پر واضح تھا کہ یہ کس کی شرارت ہے! وہ غم و غصہ اور شرارت کے اہتزاز، دونوں میں لپٹی سوائے شکایت کہ کچھ نہ کر سکیں اور والدہ کی بھی یہی حالت تھی۔

ہمارے گھر میں مرغیاں ہوتی تھیں، جنھیں اگر پکانے کا ارادہ ہو تو مولوی صاحب سے ذبح کرانا پڑتا تھا۔ وہاں ایک مولوی صاحب تھے، جو ازراہ خدمت چھری پھیرنے کا کام کر دیتے تھے۔ والدہ نے ایک دفعہ مرغا زاہد کو دیا کہ ذبح کرالائے، مولوی صاحب نے شرارت سے کہا کہ مرغ کے پائے کس کو کھلاؤ گے؟ زاہد نے کہا کسی کو نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا: ہمیں بھی نہیں کھلاؤ گے! بہرحال زاہد مرغ ذبح کرا کے گھر لے آیا، والدہ نے پر وغیرہ اتار کر کاٹا۔ زاہد سے کہا کہ پر وغیرہ کوڑے میں ڈال آؤ، لیکن زاہد نے مرغ کے پائے ہاتھ میں پکڑے اور چل دیے، مولوی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پائے ان کو تھما دیے۔ وہ بہت ناراض ہوئے اور شام کو آکر والد صاحب سے زاہد کی شکایت کی۔ والد صاحب حیران تھے کہ اس نے کیا کر ڈالا ہے۔ پوچھنے پر زاہد نے کہا: انھوں نے خود مانگے تھے۔ مولوی صاحب کیا کرتے، بس یہ کہہ سکے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔

ہمارے نانا، صوفی تھے، اور طب کے ماہر تھے۔ ادھر زاہد طباع تھے۔ اس لیے چھلیں خود تخلیق کیا کرتے تھے۔ ہماری ایک ممانی تھیں، جو تقریباً ہر روز والدہ سے ملنے آجاتیں اور اپنے دکھڑے سناتی تھیں۔ ہم سب بچے ان سے کچھ تنگ بھی تھے کہ نہ صرف والدہ کو تنگ کرتیں، بلکہ ہمارے لیے بھی باعث زحمت بنتی تھیں، لیکن والدہ کا حکم تھا کہ کسی نے ان کے ادب احترام میں کمی نہیں کرنی۔ انھیں ایک جسمانی عارضہ تھا، جس کا تقریباً وہ ہر روز تذکرہ کرتیں۔ تو زاہد نے نانا جان کی طب کے مطابق ایک دن انھیں نسخہ تجویز کیا۔ وہ یہ تھا کہ ایک چھٹانک اڑتے کوے کی بیٹ، آدھ پاؤ سوتے بچے کی اجابت لے کر، سات دن تک چھاؤں میں سکھالیں، پاؤ خشخاش میں ملا کر پیس کر سفوف بنالیں۔ روزانہ تین وقت دودھ کے ساتھ کالی مرچ کے برابر لیں۔ ایک ماہ تک مرض جاتا رہے گا۔ ہماری ممانی اس قدر گاڑھے طبّی بیان سے متاثر ہو کر بولیں: مجھے لکھ دو، میں بھول نہ جاؤں!

یہی شرارتی زاہد، والدین کا عجیب فرماں بردار بھی تھا۔ ہمیں والدہ پڑھاتی تھیں۔ وہ اچھی استاد تھیں، تمام مضامین کا ایک ایک سوال روزانہ ہم سے سنتی تھیں۔ اس معاملے میں ذرا سخت تھیں۔ شاید زاہد پانچویں کا طالب علم تھا، جب کی یہ بات ہے، والدہ پڑھا رہی تھیں، زاہد نے ایک سوال نہیں سنایا تو انھوں نے سزا کے طور پر زاہد سے کہا کہ برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر سوال یاد کرو۔ والدہ یہ کہہ کر اٹھ کر اندر گئیں، کمر سیدھا کرنے کو لیٹیں اور نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ دو گھنٹے سوتی رہیں۔ زاہد کے اوپر دھوپ آچکی تھی، لیکن وہ وہیں کھڑا رہا، جب والدہ کی آنکھ کھلی اور دیکھا تو بھاگی آئیں اور پیار سے زاہد کو ساتھ لگایا، چھاؤں میں لے گئیں اور ٹھنڈا پانی وغیرہ پلایا۔ ہمیں سمجھاتے ہوئے وہ اس واقعے کو کئی دفعہ دہراتیں۔ جوانی میں والدین کی یہی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فرماں برداری خدا کی فرماں برداری میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا، عبادت اور دیانت میں للہ فی اللہ پرہیز گار رہے۔ رشتہ دار ایک دوسرے کو باتیں کرتے ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا، جب کوئی والدہ کو کوئی بات وغیرہ کرتا، تو وہ ضرور بدلہ لینے چلے جاتے، بھلے بعد میں وہ بھی والدہ ہی کو بھگتنا پڑتا۔

والد صاحب کی وفات کے بعد، انھوں نے چھوٹے بھائیوں کا بڑے بھائیوں کی طرح، بہت زیادہ خیال رکھا۔ طالب صاحب الگ ہو چکے تھے، مگر پھر بھی ہمت بھر مالی تعاون کرتے رہے، زاہد اور میں کماتے تھے۔ زاہد کل وقتی ملازم تھے، اور میں تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ والدہ بہت بیمار رہنے لگی تھیں، لہٰذا سوچا گیا کہ شہر سے گھر بیچ کر کسی کھلے علاقے میں جا یا جائے۔ ہم نے اپنا گھر بیچ کر لاہور کے مضافات میں زمین خرید کر گھر بنانا شروع کیا۔ تعمیر کا یہ سب کام زاہد ہی نے اپنی نگرانی میں کرایا، ہمارا کردار بس معاونین ہی کا تھا۔

زاہد جوانی میں بہت خوش لباس، اور خوش اطوار تھے، لیکن کوئی پچھلے دس پندرہ برس سے ترک دنیا کا طرز حیات اپنا لیا تھا۔ اسے طبیعت کا اقتضا کہیے یا متصوفانہ طرز حیات، ہر دو صورت میں نتائج ایک سے ہیں۔ ہم جس سر زمین میں بستے ہیں، وہ تصوف کی جنم بھومی ہے، جہاں فقر ایک اکتسابی مقام بھی ہے اور خدا کی تقدیر بھی۔ 'الفقر فخري' کا نعرہ یہاں تفاخر کی حد تک قبولیت پائے ہوئے ہے۔ ایک دفعہ میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ میرے ایک جاننے والے —— جن کے کئی جھگڑوں میں، مجھے ''سیانے آدمی'' کا کردار ادا کرنا پڑا —— کا دوست گاڑی میں آتے ہوئے ملا۔ اس نے مجھے اتر کر گاڑی میں بٹھایا اور بٹھاتے ہی بولا: جو دوسروں کو بخشنے والے ہیں، سبحان اللہ وہ بے نیازی کی وجہ سے خود خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا: نہیں بھئی، میرا اس فقر میں قصور تو ہو سکتا ہے، کمال کوئی بھی نہیں ہے۔ اس نے اس پر بھی سر دھنا، اور مزید گرویدگی کا اظہار کیا، اس گناہ گار کو لگا کہ وہ شخص مجھے بہت پہنچا ہوا بزرگ سمجھ رہا ہے، لہٰذا خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ زاہد کے ہاں دین کا تصور تو وہی تھا، جو استاذ گرامی کا ہے۔ لیکن ترک دنیا کی حد تک وہ متصوفانہ روش پر قائم تھے۔ یہ روش انھیں میرے نانا اور والد صاحب سے ملی تھی۔ آخری عمر میں ترک موالات بھی طبیعت میں در آئی تھی۔ زاہد اسی وصف کی بنا پر جلد اللہ کو پیارے ہوئے۔ دل کے عارضے میں کچھ برس سے مبتلا تھے، مگر علاج معالجے کی ہماری تمام مساعی بے سود رہیں، بلکہ ایک عرصے تک ہم ان کے مرض سے آگاہ بھی نہیں تھے، کیونکہ وہ کسی کو بتاتے بھی نہیں تھے۔ اس مرض سے پہلے بھی وہ یا ان کے بچے کسی وجہ سے دو تین دن ہسپتال میں رہ آتے، ہمیں دنوں بعد کسی ملاقات میں پتا چلتا کہ وہ ہسپتال داخل رہے ہیں۔ ان کے منفرد ہونے کے یہ تمام پہلو تھے۔ مرتے وقت

بھی انھوں نے وہ دن چنا جس میں کم ہی لوگ مرا کرتے ہیں، یعنی عید کا دن۔

دفتر سے آکر گھر میں ٹکے رہتے، کوئی دوستی، شغل وغیرہ نہیں تھا، البتہ شاعری کرتے تھے۔ اس وقت ان کا ایک شعر یاد آرہا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں بھی احسان کے زیر بار ہونے سے گریز کی خو جھلکتی ہے، گو مضمون التفات کا ہے:

اپنی راتوں کو نہ کر برباد تو
میری خاطر دیر تک جاگا نہ کر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

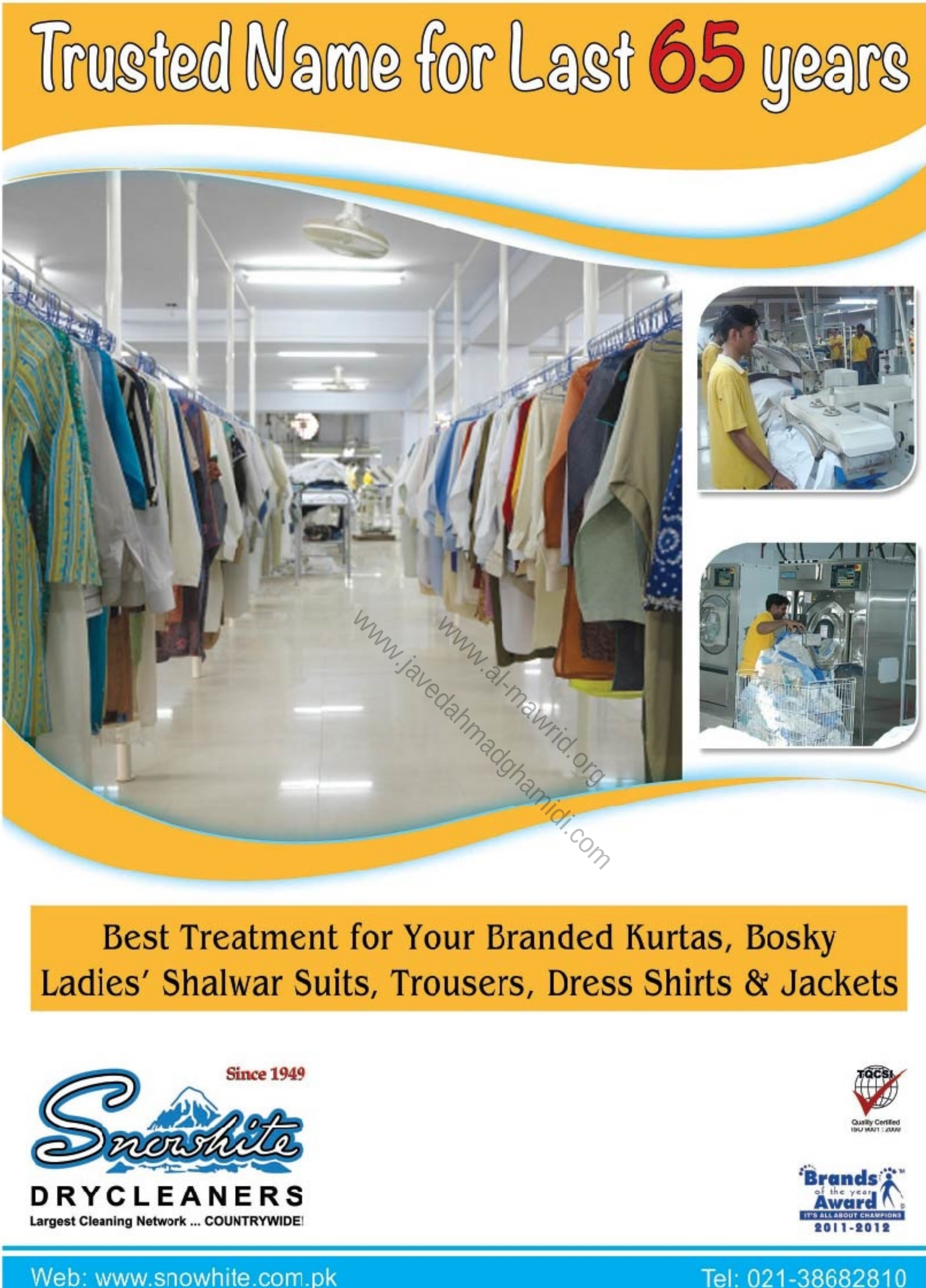

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

Monthly
ISHRAQ
Lahore

September 2019
Vol.31 No.09
Regd No.CPL-183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

لئن شکرتم لازیدنکم
اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا (القرآن)

PRAISE BE TO ALLAH, LORD OF THE WORLDS

150+ within 250 days keep counting...

ALLIED SCHOOLS
Project of Punjab Group of Colleges

Allied Pre School
Allied School

Growing Together

Ar-Rahman Campus-JHELUM
Outside Classroom Education
Inter-Campus Transfer
Sahi Campus-SHAHKOT
Al-Fajar Campus-LAHORE
Ghazi Campus-OKARA
Rehman Campus-GUJRANWALA
Pak Campus-LAHORE
Web Portal
Parent-Teacher Meetings
Harbanspura Classic Campus-LAHORE
Sialkot Campus-SIALKOT
Al-Miraj Campus-LAHORE
Sibling Discount
Sir Syed Campus-LAHORE
Capital Campus-ISLAMABAD
Ellahabad Campus-ELLAHABAD
Cantt Campus-GUJRANWALA
Ferozpur Road Campus-LAHORE
Raiwand Road Campus-LAHORE
Sargodha Road Campus-FAISALABAD
Farooqabad Campus-FAROOQABAD
Jhelum Campus-JHELUM
Marrium Campus-JOHARABAD
Spoken English
Character Building
Grace Campus-LAHORE
Gojra Campus-GOJRA
Lodhran Campus-LODHRAN
Bhimber Campus-BHIMBER
Shakargarh Campus-SHAKARGARH
Standardized Curriculum
Shahlimar Campus-FAISALABAD
Sahiwal Campus-SAHIWAL
Entry Test Preparation
DC Road Campus-GUJRANWALA
Ali Pur Chattah Campus-ALI PUR CHATTAH
Al-Ahmad Campus-LAHORE
Bahawalpur Campus-BAHAWALPUR
Mock Assessment
Educational Insurance
Tulip Campus-LAHORE
Satellite Town Campus-GUJRANWALA
Bilal Campus-BHALWAL
Professional Development of Teachers
Zafarwal Campus-ZAFARWAL
Attendance by SMS
Concept-Based Teaching
Wapda Town Campus-GUJRANWALA
Exclusive Early Years Education
Burewala Campus-BUREWALA
Husnain Campus-SAMBRIAL
Bedian Campus-LAHORE
Peshawar Road Campus-RAWALPINDI
Gulshan-e-Ravi Campus-LAHORE
Samanabad Campus-LAHORE
Sadar Campus-LAHORE
Satellite Town Campus-RAWALPINDI
GT Road Campus-GUJRANWALA
Kamalia Campus-KAMALIA
Extra & Co-curricular Activities
Ar-Raheem Campus-DINA
Walton Campus-LAHORE
Johar Town Campus (South)-LAHORE
Merit Scholarships
Career-Path Counseling
Akbar Campus-VEHARI
Hyderabad Campus-HYDERABAD
Samanabad Campus-FAISALABAD
Kamoke Campus-KAMOKE
Chauburji Campus-LAHORE
Sargodha Campus-SARGODHA
Dunyapur Campus-DUNYAPUR
Peoples Colony Campus-FAISALABAD
Hafizabad Campus-HAFIZABAD
Chichawatni Campus-CHICHAWATNI
Wazirabad Campus-WAZIRABAD
Subhan Campus-PATTOKI
PECO Road Campus-LAHORE
Art, Craft & Music
Allama Iqbal Town Campus-LAHORE
International Standards
Peoples Colony Campus-GUJRANWALA
Kasur Campus-KASUR
Al-Fateh Campus-KOT ABDUL MALIK
Dinga Campus-DINGA
Johar Town Campus (North)-LAHORE
Kotla Campus-KOTLA ARAB ALI KHAN
Thana Campus-MALAKAND AGENCY
Ahmed Campus-RAHIM YAR KHAN
Faisalabad Campus-FAISALABAD
Muridke Campus-MURIDKE
Salaar Campus-RAWALPINDI
Swat Campus-SWAT
Lalamusa Campus -LALAMUSA
Medina Campus-FAISALABAD
Teaching through Animation
Fatima Campus-DASKA
Adyala Campus-RAWALPINDI
Oasis Campus-BAHAWALPUR
Taunsa Campus Campus-TAUNSA SHARIF
Mumtaz Campus-MULTAN
Health & Hygiene Guidance
Rahim Yar Khan Campus-RAHIM YAR KHAN
English Medium
Jalal Pur Jattan Campus-JALAL PUR JATTAN
Bukhtiyari Campus-LAHORE
Narowal Campus-NAROWAL
Jinnah Campus-NOWSHERA VIRKAN
Malakwal Campus-MALAKWAL
Sadiqabad Campus-SADIQABAD
DG Khan Campus-DERA GHAZI KHAN
Gujrat Campus (South)-GUJRAT
Mirpur Campus-MIRPUR AZAD KASHMIR
Playgroup to University Education
Quaid Campus-TOBA TEK SINGH
Model Town Campus-GUJRANWALA
Mandi Bahauddin Campus-MANDI BAHAUDDIN
Mouaz Campus-MANANWALA
Al-Ghaffar Campus-SARA-E-ALAMGIR
Chenab Campus-PARHIANWALI
Bhakkar Campus-BHAKKAR
Qila Didar Singh Campus-QILA DIDAR SINGH
Zaimas Campus-SHEIKHUPURA
Hujra Shah Muqeem Campus-HUJRA SHAH MUQEEM

Group Corporate Office, Allied Schools & Punjab Colleges, 64-E-I, Gulberg III, Lahore - Pakistan. Ph: 042 35756357-58

www.alliedschools.edu.pk